خلیل صدیقی

زبان کا ارتقاء

جملہ حقوق دائمی بحق پبلشرز محفوظ

—:o:—

سال اشاعت :۔ ۱۹۷۷ء

تعداد :۔

قیمت :۔

پیش خدمت ہے **کتب خانہ** گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
📱 0307-2128068
@Stranger ❣️❣️❣️❣️❣️❣️❣️

ناشر :۔ قلات پبلشرز ۔ کوئٹہ

مطبوعہ :۔ قلات پریس - رستم جی لین
جناح روڈ کوئٹہ

فہرست

لسانی تغیرات اور ان کے اسباب

ترقی یا لسانی انحطاط

دیباچہ

ہماری روز مرہ زندگی میں زبان جو اہم کردار ادا کرتی ہے اس کا اقتضایہ ہے کہ ہم اس کے بنیادی اصولوں کو سمجھنے کی بھی کوشش کریں۔ بہت سے ماہرین لسانیات ان اصولوں کی تدوین اور وضاحت کرتے رہے ہیں اور اب تو لسانیات ایک تجربی علم کی حیثیت سے موقر مقام حاصل کر چکی ہے۔ امریکی ماہر لسانیات **سائمیون پاٹر** کے قول کے مطابق لسانیات کا طالب علم ایسی تکنیک پیدا کرنے میں کامیاب ہوچکا ہے جو انسان اور انسانی اداروں سے تعلق رکھنے والی کسی دوسری سائنس کی تکنیک سے ہٹی نہیں ہے۔ اصوات، ارکان، الفاظ محاوروں اور فقروں کا معروضی تجزیہ زیادہ سے زیادہ مرکز توجہ بن رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لسانیات کے فروغ کے اسباب علمی ہی نہیں بلکہ سیاسی بھی ہیں تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زبان ایک طرح کی تکثری سائنس یا آم العلوم ہے کیوں کہ سائنسی دعووں کا وسیلہ وہی ہوتی ہے اور زبان کا مطالعہ اپنے دامن میں بہت سے علوم کو سمیٹ لیتا ہے۔ لسانیات کے اخذ کردہ نتائج تاریخ انسانی نیز انسانی ذہن، مزاج، ثقافت، نسلی رشتوں کی تاریخ، بشریات کے مسائل اور خود حضرت انسان کو سمجھنے کے لئے بڑے کار آمد اور دل چسپ ثابت ہوتے ہیں۔ لسانیاتی تکنیک کی زیادہ سے زیادہ

ترقی یافتہ صورت، دوسری زبانوں کے سیکھنے اور ان میں بول چال کی مہارت پیدا کرنے میں ممدو معاون ہوسکتی ہے اور اس طرح بالواسطہ بین الاقوامی رشتوں کو انسانی سطح پر بھی استوار کرسکتی ہے -

لسانیات جدید مغربی دنیا میں بالعموم اور امریکہ اور روس میں بالخصوص زیادہ سے زیادہ فروغ پا رہی ہے یہ ممالک بین الاقوامی رشتوں کے گونا گوں شعبوں میں براہ راست یا بالواسطہ لسانیات کا سہارا بھی لے رہے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے وطن میں لسانیات کی اہمیت کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ ہمارے یہاں اب تک لسانیاتی تحقیق کا کوئی قابلِ ذکر مرکز بھی قائم نہیں ہو سکا بعض یونیورسٹیوں میں لسانیات کا شعبہ معرض وجود میں آ تو گیا ہے لیکن ابھی اپنے ابتدائی مراحل طے کرکے اپنا صحیح جواز بھی پیش نہیں کر سکا ہے اردو دنیا میں تو لسانیات کی عمر بہت ہی کم ہے - اور اس کی طرف توجہ مبذول کرنے والے معدودے چند افراد ہی نظر آتے ہیں - انھوں نے بھی اردو کی لسانی تاریخ یا تقابلی مطالعے کے دائرے سے باہر نکلنے کی زحمت گوارا نہ کی جدید لسانیات اور اس کی ترقی یافتہ تکنیک سے استفادہ کرنے کے لئے لسانیات کی مصطلحات اور مبادیات سے واقفیت اشد ضروری ہے — لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ماہرین لسانیات نے مصطلحات اور مبادیات کی توضیح کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا

یہ تالیف مبادیاتِ لسانیات ہی سے تعلق رکھتی ہے اور اسے بعض مغربی ماہرین لسانیات سے استفادے کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

زبان بنی بنائی صورت میں انسان کو نہیں ملی ہے بلکہ وہ

انسان کی سالہا سال کی تجرباتی کوششوں سے وجود میں آنے والی نطقی روایت کے نسلاً در نسلاً منتقل اور متغیر ہوتے رہنے کا نتیجہ ہے۔ اس کے تغیر و تبدل اور تراش خراش کے دامن میں صوتی آنکھ مچولیاں ہی نہیں بلکہ تہذیبی سفر، نفسیاتی کرشموں اور سیاسی و معاشی نیرنگیوں کی داستانیں بھی ہیں — سالہا سال کی مسافت کے نشیب و فراز نے انسانی آوازوں کی کایا کلپ بھی کی ہے مختلف عوامل انسانی اصوات کے سفر کے رخ کو بدلتے ہیں لیکن زبان کے ارتقا کی طویل داستان کو کس طرح سمیٹا جا سکتا ہے؟ — کیا یہ ممکن نہیں کہ اسے تین حصوں میں تقسیم کر لیا جائے؟ اول ما قبل تاریخ، جس میں وہ ابتدائی منزل شامل ہو جو نطق انسانی کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے — دوم ابتدائی تاریخ یا قدیم ترین تاریخ جس کا مقصد اشاراتی اور ابتدائی نطقی ابلاغ سے لے کر زبان کی ابتدائی صورت تک کے مرحلوں کی تشکیل جدید ہو، اور سوم تاریخی دور جس میں زبانوں کے مختلف نظاموں اور ان کے ارتقا کے اصول و ضوابط کا تذکرہ ہو۔ منطقی نقطۂ نظر سے متقدم یا ما قبل وجود اور ابتدائی حالتوں اور تخلیقی اور ترقی یافتہ صورتوں میں بھی تمیز کرنا ضروری ہے۔ اسی لئے اس تالیف میں زبان کے آغاز و مسائل سے بھی بحث کی گئی ہے اور اس کے تغیر و تبدل یا ارتقا کے مناہج اور اصول سے بھی — اس ضمن میں راقم الحروف نے زیادہ سے زیادہ ماہرین لسانیات سے استفادے کی کوشش کی ہے۔

اس تالیف کی تدوین اور اشاعت کے موجب زمرد حسن صاحب ہیں — انہی کے پیہم تقاضوں نے ایک منصوبے کو صفحات پر منتقل کرایا ہے۔

خلیل صدیقی

کوئٹہ

تمہید

زبان کے تصور کے ساتھ ساتھ اس کی تاریخی خصوصیت کا یہ تصور بھی ابھرتا ہے کہ زبان کوئی بنی بنائی چیز نہیں۔ اس کا ایک ایک لفظ، لفظوں کی ترتیب، اور ان سب کی موجودہ حیثیت نتیجہ ہے گوناگوں تبدیلیوں کا۔ اس کے طویل ماضی میں جو تغیرات بھی ہوتے رہے ہیں، خواہ ان تغیرات کے اسباب کچھ بھی رہے ہوں، انہی کی بدولت اس نے موجودہ روپ دھارا ہے لیکن اس کی تبدیلیوں کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوگیا، اس نے ایسی کامل صورت اختیار نہیں کرلی کہ اب تغیر پذیر نہیں رہی۔ مستقبل میں آنے والی تبدیلیوں کی بدولت نہ جانے کتنی کروٹیں بدلنی پڑیں گی اور نہ جانے کتنے نئے نئے روپ دھارنے ہوں گے۔ اس کے ارتقا کی منزلیں یونہی طے ہوتی رہیں گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ارتقا کا یہ دھارا رک جائے اور آسے آہستہ آہستہ معدوم ہونا پڑے۔

بنی نوع انسان نے اپنی طویل تاریخ کے دوران ان گنت زبانیں تخلیق کی ہیں۔ اس کا یہ تخلیقی عمل متعدد تجربات کی منزلوں سے گزرتا رہا ہے۔ انسان اور زبان کا رشتہ اتنا ناگزیر ہے کہ

زبان کے بغیر انسان کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن انسان فطرت کے چیلنج کا جواب دینے اور فطرت کی اندھی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے ساتھ ساتھ جو ذہنی اخلاقی اور مادی اکتسابات کرتا رہا ہے ان کے نتیجہ میں وہ خود بھی بدلتا رہا ہے زمان اور مکان کی تبدیلی کے ساتھ اس کے اکتسابات بھی بدلتے رہے ہیں اور وہ روایتیں وجود میں آتی رہی ہیں، جو ثقافت زبان، فن اور علم کی حیثیت سے ابھرتی رہیں اور ان میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ جو عناصر ماضی کے دھندلکوں سے دھندلا نہ سکے، وہ عصری تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے نئے روپ دھارتے رہے، ان میں اضافے بھی ہوتے رہے، اضافوں نے انہیں کچھ کا کچھ بھی بنا دیا۔ لیکن جن عناصر میں اتنی تابناکی نہ تھی کہ ماضی کی دھند میں بھی تھوڑا بہت چمک سکیں اور عصری تقاضوں کی کسوٹی پر پورے اتر سکیں وہ گھپ اندھیرے میں ڈوب گئے۔ انسانی زبانوں کا بھی یہی مقدر رہا ہے۔ انسان کی انفرادی ضرورتیں اور اس کے سماجی تقاضے اظہار و ابلاغ کی بہت سی صورتوں کا تجربہ کرتے رہے ہیں اور ان تجربات کے نتیجہ میں نت نئی بولیاں تشکیل پاتی رہی ہیں، بہت سے الفاظ ہنگامی ضرورت کے تحت اضطراری طور پر بھی وجود میں آئے، بہت سے ارادی تشکیل کے مرہون منت بھی ہوئے۔ بہتوں نے قبولِ عام بھی پایا اور زبان کے جزو بن گئے، فصاحت نے انہیں اپنے دامن میں جگہ دی۔ بہت سے زبانوں کی بارگاہ میں باریاب نہ ہو سکے۔ اور زبانوں کی ان لکھی تاریخ اس طرح ترتیب پائی گئی کہ آج یہ بھی کوئی نہیں جانتا کہ زمانی اعتبار سے ان کے نقطہ آغاز کا تعین کیسے ہو؟ جو الفاظ استعمال ہو رہے ہیں ان کا ناطق اولین کون ہے؟

جس ترتیب سے انہیں استعمال کیا جاتا ہے اس کا پہلا مدون کون ہے؟۔ زمان و مکان کی تبدیلیوں اور سیاسی، معاشی اور معاشرتی تغیرات نے ' انسان کے مزاج اور عادتوں نے ' اس کی نفسیات اور نطق و سماعت کی کرشمہ سازی نے اس میں تصرفات بھی کئے اور اضافے بھی۔ صوتی سیاق سباق کے زیر اثر لب و لہجہ کی نیرنگیاں پیدا ہوئیں۔ مختلف عوامل نے مل کر اصوات' ارکان' نقرہ زیر و بم وغیرہ کو بھی بدل دیا۔ تبدیلیاں صوتی بھی ہوئیں اور معنوی بھی۔ کبھی یہ تبدیلیاں خفی رہیں کبھی جلی۔ کہیں یہ بتدریج ہوئیں کہیں نسبتاً تیز۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ بہت سی زبانیں کالعدم ہوگئیں اور بہت سی اپنے دھندلے نقوش بھی چھوڑ گئیں لیکن یہ نقوش تحریری علامتوں کی حیثیت سے کتابوں کی زینت ہیں اور ان میں سے بہت سے اپنی صحیح اصوات کی نمائندگی بھی نہیں کرسکتے ' ان کی اصوات کی تشکیل جدید ہی کی جاتی ہے ' بعض صورتوں میں وہ بھی ممکن نہیں۔ بہت سی زبانیں بدلتی بدلاتی نت نیا روپ دھارتی رہی ہیں اور آج بھی ان گنت افراد اور قوموں میں ذریعۂ اظہار و ابلاغ ہیں۔ جب زبانوں کا ذکر چھڑتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ فلاں زبان فلاں صدی میں پیدا ہوئی یا فلاں زبان اپنے خول میں بند ہوکر رہ گئی اور مرگئی۔ زبان کی پیدائش زندگی اور موت کے متعلق بھی باتیں کی جاتی رہی ہیں۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اس طرح کی باتیں محض استعارہ ہیں ورنہ زبان کوئی ذی حیات تو نہیں جو پیدا ہو جئے اور مرجائے۔ وہ فی نفسہ اپنا الگ مادی وجود نہیں رکھتی وہ تو محض ایک با مقصد نطقی عمل ہے ' اصوات کا ایسا تواتر اور مجموعہ جو محض علامت ہے، جس کا مدلول یا مشارالیہ

سے کوئی منطقی تعلق نہیں، بلکہ جس کی دلالت باہمی مناسبت کے سوا کچھ نہیں۔ جب تک کوئی بولنے والا نہ ہو اس کا کوئی وجود نہیں ہوسکتا۔ سننے والا نہ ہو تو اس کا کوئی مقصد نہیں ہوسکتا، خواہ سننے والا خود متکلم ہی کیوں نہ ہو۔ دل ہی دل میں بات کرنے کا محاورہ بھی ہے۔ اس کی تہ میں بھی متکلم اور سامع کا تصور موجود ہے۔ زبان کا وجود مادی نہیں نطقی اور سماعی ہوتا ہے گویا نطق و سماعت اس کی جان ہیں اور اصوات اس کے غیر مرئی جسم۔ جہاں تک ان زبانوں کا تعلق ہے جو صرف کتبوں میں نظرآتی ہیں یا کتابوں میں، وہ نطق و سماعت دونوں سے محروم ہوچکی ہیں۔ لیکن کسی نہ کسی زمانے میں وہ بھی ناطقے اور سماعت کی مرہونِ منت رہ چکی ہیں۔ انہی کو اب استعارۃ مردہ زبانیں کہا جاتا ہے مردہ اس لئے کہ اب وہ کسی کے لبوں پر نہیں، کسی کی مطلب برآری نہیں کرسکتیں، کسی سماجی تقاضے سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتیں۔ کسی زمانے میں وہ واقعی زندہ زبانیں کہلاتی ہوں گی کیوں کہ وہ کسی نہ کسی معاشرے میں مروج تھیں بولنے والوں کے جذبات و احساسات خیالات و افکار کی ترجمانی اور ابلاغ کا پورا پورا حق ادا کرتی ہوں گی۔ آج کی کئی مروجہ زبانوں میں بہت سے ایسے الفاظ نہیں ملتے جو سالہا سال بیشتر ان کے پرانے روپوں میں بلا تکلف مستعمل تھے۔ یہ الفاظ مردہ ہوچکے مردہ اس معنے میں کہ اب انہیں کوئی منہ نہیں لگاتا، ان سے کسی کا کوئی مطلب پورا نہیں ہوتا ان کی کوئی ابلاغی قدر نہیں رہی۔ اسی لئے جب زبان کے تشکیل پانے نشو و نما اور ارتقا پانے یا متروک ھوجانے کی بات نکلتی ہے تو بے اختیار زبان بولنے والے افراد یا گروہوں کی

انفرادی اور سماجی زندگی خارجی عوامل' نو بہ بنو سماجی معاشی
اور سیاسی محرکات کے ساتھ ساتھ ہوتی عادتوں' نفسیات اور
مزاج کی باتیں بھی سامنے آجاتی ہیں اور زبان کو تشکیل دینے
والے' اس میں تغیرات پیدا کرنے والے، یا ارتقا کی راہوں پر
رواں دواں کرنے والے افراد کا تذکرہ ناگزیر ہو جاتا ہے
ان افراد کا تذکرہ جو زبان میں تغیرات کا ذریعہ بنتے رہے ہیں
ڈنمارک کے مشہور ماہر لسانیات **آٹو یسپرسن** کی رائے میں افراد
کے حوالے کے بغیر لسانیات کا صحیح حق ادا نہیں ہوسکتا
اس نے افراد کے حوالے ہی سے نموئے لسان کے مباحث کو پیش
کیا ہے اور بحث کی اس صورت کو ,, لسانیاتی حیاتیات ،، کے
نام سے موسوم کیا ہے۔ امریکی ماہر لسانیات **وھٹنے** نے بھی زبان
کے بولنے والوں کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہ خیال
ظاہر کیا ہے کہ زبان کی روایت نئی نسل کو ملتی ہے تو
اس میں کچھ نہ کچھ تصرف ضرور ہو چکا ہوتا ہے۔ الفاظ
محاوروں' تراکیب ساخت کی منتقلی کی نہج ہی کچھ ایسی ہوتی
کہ کوئی زبان خالص نہیں رہ جاتی۔ اسے ,, زندہ ،، رکھنے
والوں ہی کی بدولت تغیرات بتدریج رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اس
اجمال کی تفصیل دوسرے ماہرین لسانیات کے یہاں بھی
مل سکتی ہیں لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بعض
ماہرین نے اس حقیقت کو نظر انداز ھی نہیں کیا بلکہ جھٹلایا بھی
ہے اور یہ نقطہ' نظر پیش کیا ہے کہ زبان اپنے بولنے والوں سے
آزاد رہ کر زندگی رکھتی ہے۔ ایسی زندگی جس میں انسانی
مداخلت ممکن نہیں۔ برطانوی شہریت اختیار کرلینے والے جرمن
ماہر لسانیات **میکس ملر** نے ,, زبان کی سائنس ،، کے لیکچروں کے
پہلے سلسلے کے دوسرے لیکچر میں یہ کہا ہے کہ

,, اگر چہ زبان میں مسلسل تغیرات ہوتے رہتے ہیں تاہم انسان کی قدرت میں یہ بات نہیں کہ وہ تغیرات کرئے یا انہیں روک دے زبان کے قواعد و ضوابط کے تغیر کا تصور یا اپنی مرضی کے مطابق کسی لفظ کی اختراع کا تصور ایسا ہی ہے جیسے کہ دورانِ خون کے قوانین کی تبدیلی یا اپنے قد کو بڑھانے کا تصور ''۔ اس نے اس رائے کو صحیح ثابت کرنے کے لئے دو تاریخی مثالیں بھی پیش کی ہیں، وہ یہ کہ روم کے شہنشاہ **طبی ری اس** اور جرمنی کے حکمران **سگسمنڈ** نے اپنی لاطینی میں غلطیاں کیں تو ان غلطیوں کی گرفت کی گئی اور قواعد دانوں نے انہیں یہ جتا دیا کہ وہ کتنے ھی با اقتدار سہی انہیں لاطینی زبان میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا میکس ملر کی منطق یہ ہے کہ ,, جب **سگسمنڈ** جیسا ذی‌سطوت بادشاہ اپنے عہد میں لاطینی کے ایک لفظ کی جنس اور لاحقے میں تبدیلی کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا، حالاں کہ اس وقت لاطینی کی حیثیت ایک مردہ زبان سے زیادہ نہ تھی' تو ھمہ شما کی کیا مجال کہ زبان میں اسی قسم کی یا اس سے کم یا زیادہ تبدیلیاں کر سکیں۔ چناں چہ یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کسی زبان میں اپنے بولنے والوں کے ذریعہ سے تبدیلی کا امکان نہیں ھوتا ''۔ (بحوالہ ,, لسان مطالعہ' لسان '' از وھنیے ص ۳۶۵) ان مثالوں سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ لاطینی اس وقت مروجہ زبان نہیں تھی، اس کی سند بول چال سے حاصل نہیں ہوسکتی تھی' بلکہ وہ تو کتابوں میں محفوظ تھی اور اس کے کتابی نمونے ارتقا کی ایک خاص منزل ہی کی نشان دہی کرتے تھے اس کے بعد اس کے رائج نہ رہنے کی وجہ سے مزید ارتقا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زبان کے بولنے والوں سے بھی تلفظ یا مسلمہ

قواعد کی غلطیاں، عمداً یا سہواً سرزد ہوتی رہتی ہیں، صوتی سیاق و سباق میں سہواً یا عجلت کی وجہ سے الٹ پھیر بھی ممکن ہے، لیکن یہ غلطیاں نہ تو لازماً مردود قرار پاتی ہیں اور نہ لازماً مقبول ہوتی ہیں۔ غلط العوام اور غلط العام کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اسی طرح غلط قیاسِ تمثیلی کو قبول عام نہیں مل جاتا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھار شعوری طور پر گھڑا ہو لفظ، اپنی اظہاریت کی وجہ سے آہستہ آہستہ دوسروں کی زبان پر بھی آجائے اور جزوِ زبان بن جائے۔ مندرجہ بالا مثالوں سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ زبان کی مملکت میں بڑے سے بڑے آمر کا حکم بھی نہیں چلتا۔ یہ مملکت عوامی ہوتی ہے۔ اس کا اقتدارِ اعلیٰ رائے عامہ ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ ہاں اگر کسی اہل منصب کی کوئی لسانی اختراع خواہ وہ تفننِ طبع ہی کے طور پر کیوں نہ ہو، عام لوگوں کے لئے دل پذیر ثابت ہو اور وہ بھی اسے اپنا لیں تو اور بات ہے، پھر بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جس نئے لفظ کو، خواہ وہ ارادی طور پر تشکیل دیا گیا ہو یا اضطراری طور پر وجود میں آیا ہو، عام بولنے والوں نے سر آنکھوں پر جگہ دی ہو، وہی مستند قرار پاتا ہے۔ وھٹنی رقم طراز ہے کہ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک حکمراں کے، ضلع جگت نے لفظ کی صورت ہی بدل دی۔ مثلاً یورپ میں تاتاریوں کو تار تار کہا جاتا ہے۔ ایک اور ,, ر '' کے اضافے کی یہ توجیہ کی جاتی ہے کہ جب فرانس میں سینٹ لوئی کے زمانے میں تاتاریوں نے مشرقی یورپ کو تاراج کرنا شروع کیا تو ان کی سنا کی کی وجہ سے سینٹ لوئی بے اختیار پکار اٹھا کہ ہم انہیں تار تار کہہ سکتے ہیں کیوں کہ ان کے کرتوت تارتارس کے بھتنوں کے

سے ہیں۔ فرانسیسی ادیبوں نے اس تشبیہہ کو بلیغ سمجھا اور لے اُڑے۔ بعد میں اہل یورپ نے بھی انہی کی تقلید کی (دو لسان و مطالعہ لسان' وھٹنے۔ ص ۳۸)۔ ممکن ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ مثال حرف بحرف صحیح نہ ہو۔ تاہم قرین قیاس ضرور ہے۔

زبان ایک سماجی ورثہ ہے اور سماج ہی کے نطقی اعمال سے یہ ورثہ نہ صرف محفوظ رہتا ہے بلکہ اس میں قطع برید بھی ہوتی رہتی ہے اور اضافہ بھی۔ یہ سب کچھ افراد ھی کی توسط سے ہوتا ہے۔ زبان کا ھر تغیر، خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ھو، اس کا ھر لفظ کسی نہ کسی فرد ھی کی بدولت رونما ھوتا ہے۔ لفظی اضافے سرمایہ زبان کو بڑھانے کی نیت سے نہیں کئے جاتے، نہ ھی اضافہ کرنے والے کو لازماً یہ شعور ھوتا ہے کہ وہ اس طرح زبان میں کوئی اضافہ کر رہا ہے۔ وہ تو اپنی ھنگامی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے زبان کے معلومہ سرمائے کو نا کافی محسوس کرتا ہے یا اس معلومہ سرمائے سے اس کی غرض پوری نہیں ھوتی تو مروجہ الفاظ کی ساخت کی نہج یا متوازی مدلول یا مشابہ مافی الضمیر کے لئے مستعمل الفاظ کی تمثیل پر قیاس کر کے کوئی لفظ گھڑ لیتا ہے اور اگر سامع بھی وھی مفہوم مراد لے لیتا ہے جو مقصود ہے تو ایسے ہی کسی اور موقع پر دہراتا ہے اور حسب ضرورت استعمال کرتا رہتا ہے اس لفظ سے دوسروں کی ایسی طرح کی احتیاج پوری ہوسکتی ہے تو آہستہ آہستہ اس کا چلن عام ہو جاتا ہے اور یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ اسے سب سے پہلے کس نے گھڑا اور استعمال کیا تھا۔ اور اگر گھڑا ہوا نیا لفظ اظہار و ابلاغ کا حق ادا نہیں کر پاتا تو جنم لیتے ہی مرجاتا ہے۔ اس

طرح ہر زبان کے نہ جانے کتنے الفاظ مرچکے ہوں گے۔ الفاظ کے خالق افراد ہی ہوتے ہیں لیکن انہیں زندگی سماج کے قبول عام کے طفیل ہی ملتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ سماج کا کوئی رکن اپنی فصاحت' طلاقتِ لسانی، دل نشیں انداز گفتگو یا کسی سماجی کارنامے کی وجہ سے ہر دل عزیز ہو جائے تو اس کی کسی لسانی اپچ کو بھی قبول عام کی سند مل جاتی ہے۔ زبان کا رشتہ انسانی سوچ بچار سے خاصا گہرا ہوتا ہے۔ ذہنی افق کی وسعت کے ساتھ ساتھ زبان بھی پھلتی پھولتی ہے معیشت کی تبدیلی بھی زبان کے فروغ کا سبب بنتی ہے۔ خانہ بدوش معیشت سے زرعی معیشت میں قدم رکھنے والے گروہ کی زبان بتدریج بدلنے لگتی ہے۔ وہ الفاظ اور محاورے جو خانہ بدوش معیشت کی جزئیات کے لئے کفایت کرتے تھے' نا کافی ثابت ہونے لگتے ہیں۔ اسی طرح زرعی معیشت کی منزل سے صنعتی معیشت میں قدم رکھنے کے بعد لسانی سرمایہ پوری طرح ساتھ نہیں دے سکتا اور لسانی اضافے نا گزیر ہوجاتے ہیں۔ غرض زبان مادی اور مرئی اشیاء پر دلالت کرنے والے الفاظ کے دائرے سے نکل کر تجرید کی منزل پر پہنچتی ہے۔ اور پھر عالموں کی ارادی تشکیل سے علمی سطح پربھی آجاتی ہے۔ نئی نئی اختراعات پر دلالت کرنے والے الفاظ جنہیں مخصوص علوم تکنالوجی کے ماہرین نے وضع کیا تھا، عوامی سطح پر بھی بلا تکلف استعمال ہونے لگے ہیں۔ زبان میں نت نئے اضافے بتدریج ہی نہیں بلکہ معلومہ سرمایہ' الفاظ سے میل کھاتے ہوئے اور زبان بولنے والوں کی صوتی عادتوں سے ہم آہنگ بھی ہوتے ہیں۔ سماج کے مسلمہ پیمانوں سے ہرانحراف اور ہر صوتی تخریب کو لبیک بھی نہیں کہا جاتا۔ اگر صوتی تخریب، مروجہ تلفظ سے اختلاف' مسلمہ ضوابطِ ترتیب سے

بغاوت، کسی قسم کی نطقی سہولت صوتی ہمواری، آہنگ کی خوشنمائی کا سبب بن سکتی ہے تو اسے گوارا بھی کرلیا جاتا ہے ۔

کسی زبان کے تغیرات، اس کے حذف و اضافے وغیرہ کا مطالعہ اس کی دور بہ دور کی ان صورتوں کے ذریعہ سے کیا جا سکتا ہے جو تحریری دستاویز میں محفوظ رہ گئی ہیں ۔ زبان کی موجودہ ہئیت کا تجزیہ اور اس کا پچھلی ہئیتوں سے تقابل یا دوسرے لفظوں میں زبان کا تاریخی مطالہ اس کے پھلنے پھولنے اور نمو پانے کے مختلف مدارج کی نشان دہی کر سکتا ہے۔ اگر تاریخی ارتقا کی کچھ کڑیاں مفقود ہوں تو ما قبل ہئتیوں میں نیز ما بعد صورتوں میں صوتی تبادل کے رخ یا صرفی و نحوی تبدیلیوں کی نہج یا صوتی عادتوں کے بدلنے کے انداز کی مدد سے نمونۂ لسان کے قاعدوں کا استخراج کیا جا سکتا ہے اور اُن کے سہارے مفقود کڑیوں کی تشکیل جدید بھی کی جا سکتی ہے ۔ اس طرح اس زبان کی قدیم ترین تحریری دستاویزوں سے لے کر اس کی موجودہ منزل تک کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے، اس کی وہ قدیم ترین ہیئت بھی جس کا کوئی تحریری نمونہ دستیاب نہیں ہوسکتا، تشکیل جدید سے معلوم ہوسکتی ہے ۔ لیکن اس تشکیل جدید کو قرینِ قیاس تو کہا جا سکتا ہے ایک تاریخی صداقت قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ کھوئے ہوئے نظام اصوات کی بار آفرینی کے دشوار گزار مرحلے کو بھی سر کیا جاتا رہا ہے لیکن یہ باز آفرینی حقیقت سے زیادہ سے زیادہ قریب تو ہو سکتی ہے لیکن عین حقیقت نہیں بن سکتی ۔

زبانوں کے تاریخی و تقابلی مطالعے، اور ان ساخت کی کے تجزیوں سے ان کی نسبی و صوریاتی گروہ بندی بھی کی گئی ہے اور انہیں مختلف خاندان ہائے السنہ میں تقسیم کرکے، ہر خاندان سے متعلقہ زبانوں کے مشترکہ سر چشموں کا سراغ بھی لگانے کی کوشش کی

گئی ہے اور ان کی تشکیلِ جدید بھی کی گئی ہے مثلاً اکثر ماہرین
لسانیات نے قدیم ترین ہند یورپی (Proto Indo European) کی
تشکیل جدید کی ہے اور یہ کہا ہے کہ اس کی ابتدائی صورت مادہ
کی منزل کہلا سکتی ہے، شروع شروع میں صرف مادے وجود میں
آئے، یہ مادے یک رکنی تھے اور سابقوں اور لاحقوں کے اضافوں
سے نئے نئے الفاظ بنتے گئے، زبانوں کے سرچشموں کی ابتدائی ہیئتوں
کی تشکیلِ جدید کو تاریخی صداقت بھی تسلیم کرلیں تو یہ سوال
پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہی کچھ ان ابتدائی زبانوں کے بولنے والوں
کی اولین منطوقات ہیں؟- یہ اولین منطوقات کس طرح وجود میں آئیں ؟
ان زبانوں کے تاریخی سفر کا نقطہ آغاز دریافت کرلینا ممکن بھی
ہے یا نہیں اس نقطہ آغاز سے سفر کس رخ پر ہوا ؟ نموئے لسان
نے تاریخی آغاز کے بعد کیا کیا صورتیں اختیار کیں؟- صوتی ابلاغ
نے واقعتہ کس طرح ارتقا کی منزلیں طے کیں؟- ہمارے پاس کوئی
ایسی تاریخی شہادت نہیں کہ ہم یہ وثوق کے ساتھ صوتی ابلاغ
کے آغاز اور ارتقا کی نہج کے بارے میں کچھ کہہ سکیں - ہاں
ہم زیادہ سے زیادہ سائنسی انداز میں یہ قیاس ضرور کرسکتے ہیں کہ
یہ سب کچھ کیوں کر ہوسکتا تھا - تاریخی سفر کے آغاز سے
پہلے زبان کن مرحلوں سے گزر سکتی ہے؟ صوتی اظہار و ابلاغ سے پہلے
اظہار و ابلاغ کی غیرصوتی صورتیں بھی ہوسکتی ہیں ؟ صوتی ابلاغ کے
آغاز ہی کو زبان کی ابتدا قرار دے سکتے ہیں؟ صوتی ابلاغ نے نمو کی کیا
کیا صورتیں اختیار کی ہوں گی یہ اور اس طرح کے مباحث کا تعلق
آغازِ زبان کے مسائل سے ہے-

آغازِ زبان کے مسائل

زبان ، بنی نوع انسان کی سب سے زیادہ قیمتی تہذیبی میراث ہے۔ اس کے تمام ذہنی و تہذیبی، اخلاقی و روحانی ورثے، اسی کے مرہونِ منت ہیں ، براہِ راست یا بالواسطہ۔ اس کا منبع قدیم ترین ماضی کی ایسی تاریکیوں میں پوشیدہ ہے کہ نگاہِ تحقیق کا وہاں تک پہنچنا اور براہِ راست پا لینا ممکن نہیں۔ تجربی شواہد کے فقدان کی وجہ سے اولین انسان کے ذہن کی ماہئیت اور اس کے تفاعل کے علم کے ساتھ ساتھ زبان کے نقطۂ آغاز سے براہِ راست واقفیت کیوں کر ممکن ہے؟ ابتداہی سے انسان کا تجسس اسے حیات و کائنات کی ماہئیت کو سمجھنے ، ان کے محرکات و اسباب کا کھوج لگانے اور منبع و آغاز ڈھونڈ نکالنے پر اکساتا رہا ہے۔ جب تک مافوق الفطرت طاقتوں یا تقدیرِ الٰہی پر عقیدہ راسخ رہا ، اس وقت تک حیات و کائنات کی الہامی توجیہات ہی اطمینان بخش ثابت ہوتی رہیں لیکن جب یہ عقیدہ متزلزل ہوا اور انسانی ذہن پر الہامی توجیہات کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی تو عقل و شعور کی رہ نمائی حاصل کی گئی اور آہستہ آہستہ سائنسی نقطۂ نظر پیدا ہوا۔ زبان کے الہامی آغاز کا تصور بھی پارینہ ہوگیا اور زبان کے آغاز سے متعلق کسی واضح اور قرینِ عقل نتیجے پر پہنچنے کی امید پر زبان کی تاریخ کھنگالنے کی تحریک ہوئی۔ زبان کا مطالعہ تاریخی نقطۂ نظر سے کیا گیا

عہد بہ عہد کی منتشر کڑیوں کو جوڑنے کی کوشش کی گئی۔ معلومہ و مصدقہ شواہد کی مدد سے ماضی کے گم شدہ خدوخال کو ترتیب دینے کی بھی سعی کی گئی اور یہ یقین پیدا ہو گیا کہ زبان کے ارتقا کی مختلف ابتدائی منزلوں کی تشکیل نو کے بعد اس کے نقطہ آغاز کو پالینا ممکن ہے۔

لسانیات کی تاریخ میں زبان کے آغاز کا مسئلہ اکثر معرض بحث میں آتا رہا ہے۔ اس موضوع پر مختلف دبستان فکر اور مختلف سطح کے ماہرین نے جتنی زیادہ توجہ دی ہے اتنی کسی اور موضوع کو نصیب نہ ہو سکی لیکن اس غیر معمولی توجہ اور تحقیق و تدقیق کا ماحصل زیادہ کارآمد ثابت نہ ہوسکا۔ اس ضمن میں جو کچھ پیش کیا جاتا رہا ہے اس کا بیشتر حصہ قیاسی باتوں اور مفروضات پر مشتمل ہے۔ موضوعی رایوں پر زیادہ زور دیا جاتا رہا ہے اور ان کو آیت و حدیث کی حیثیت دینے کی مضحکہ خیز صورتیں بھی اختیار کی جاتی رہی ہیں۔ اسی لئے ایک زمانے میں بہت سے سنجیدہ ماہرین لسانیات اس موضوع کو غیروقیع بھی سمجھنے لگے تھے۔ فرانس کی "سوسائٹی دا لنگوسٹک" نے اس موضوع پر اظہار رائے اور بحث و تمحیص کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اسی سوسائٹی کے بہت سے اراکین نے اسی موضوع پر دھڑا دھڑ مضامین اور کتابیں شائع کیں۔ آغاز زبان کا مسئلہ متنازعہ فیہ ہی رہا۔ اور اس ضمن میں متعدد نظرئیے منظر عام پر آئے مثلاً اختراعی نظریہ، جس کی رو سے زبان انسان کا تخلیقی عمل ہے' حادثاتی یا اتفاقی نظریہ' جو زبان کے آغاز کو محض ایک اتفاق سے تعبیر کرتا ہے۔ نظریہ ارتقا کے زیراثر آغاز زبان کے تولیدی نظرئیے وجود میں آئے، جن میں زبان کی ابتدائی صورتوں کی تشکیل نو اور بچوں اور جانوروں کی نفسیات سے

اخذ شدہ مواد کی مدد سے مفقود اسانی کڑیوں کی فراہمی پر خصوصی توجہ دی گئی۔

کسی علمی مسئلہ کا حل تلاش کرنے سے پہلے، اس کی وسعت اور حدود کا صحیح تعیین ضروری ہے۔ اس میں ایسی باضابطگی اور قطعیت ہونی چاہئیے کہ اضافی نقطہ ہائے نظر کا امکان کم سے کم رہ جائے۔ آغازِ زبان کے مبحث میں لفظ آغاز اضافی حیثیت رکھتا ہے۔ جب تک یہ واضح نہ کیا جائے کہ آغاز سے کیا مراد ہے (اور اس وضاحت کو مسلمہ حیثیت بھی حاصل ہو) مبحث کی متفقہ اساس پیدا ہی نہیں ہوسکتی۔ مشہور امریکی ماہر لسانیات وھٹنے کے نزدیک اس متفقہ اساس کے فقدان ہی کی وجہ سے آغاز زبان کا مسئلہ متنازعہ فیہ رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ "زبان کے مسئلے کا تعلق" زبانوں کے باہمی رشتوں کے مسئلے کی طرح، بلاواسطہ لسانی شواہد سے نہیں بلکہ فلسفۂ لسان سے ہے اور اس کے بنیادی نظریات ہی سے اس مسئلے کا حل منسلک ہے۔ یہ مسئلہ اسی وقت حل ہوسکتا ہے جب فلسفۂ لسان کے عظیم اصول مستحکم بنیادوں پر قائم کئے جائیں اور زبان کی ماہئیت، انسانی ذہن وفکر سے اس کے روابط، انسانی اور حیوانی طرقہائے اظہار کے باہمی تعلق کے بارے میں ماہرین لسانیات کی رایوں میں بعدالمشرقین نہ ہو۔ آغازِ زبان کا مسئلہ خالص علمی مسئلہ ہے اور علمی نقطۂ نظر کا اقتضایہ ہے کہ انسانی زبان کے مصدقہ حقائق کے ساتھ ساتھ انسانی مزاج کی خصوصیات کو بھی تحقیق کی اساس بنایا جائے، ان کا معروضی تنقیہ اس طرح کیا جائے کہ زیادہ سے زیادہ نتیجہ خیز ہوسکے۔ زبان اپنے آغاز کی جو کہانی اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہے اس کو سننے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ مروجہ موقفوں سے مستنبط نتائج کا موازنہ

کرکے تماثل و اختلاف کی جانچ پڑتال کی جائے ' نئے نئے لسانی حقائق سے تصدیق و توثیق یا ترمیم و تنسیخ کی جائے۔ تحقیق کے سلسلے میں مخصوص افراد یا نسلوں کی کسی خصوصی صلاحیت یا جبلت کا التزام یا ان کے با معنی صوتی اظہار کے آغاز پر اصرار علمی نقطہ‌ٔ نظر کے منافی ہے۔ اس مسئلے کے تاریخی اور نظری پہلوؤں کے درمیان حد فاصل کھینچنا بھی ضروری ہے۔ آغازِ زبان کی تاریخی تحقیق زبان کے ماضی میں کچھ دور تک تو رہنمائی کرسکتی ہے لیکن منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتی۔ وہ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ اولین قائل نے مخصوص خیال یا تصور کے لئے ایک خاص صوتی اشارہ ہی کیوں استعمال کیا۔ وہ یہ بھی ثابت نہیں کرسکتی کہ وہ مخصوص صوتی اشارہ ' نطق انسانی کا پیش خیمہ تھا یا وہ قبولِ عام اختیار کرکے رائج بھی رہا۔ زبان کی تاریخی تحقیق' ما قبل تاریخ کی زبان سے متعلق کچھ قیاسات کی اساس تو بن سکتی ہے' استقرائی کوششوں سے کچھ نتائج کا استنباط تو کیا جا سکتا ہے لیکن انسان کے اولین کلمات کی حتمی نشان دہی ناممکن ہے۔

بہت سے ماہرینِ لسانیات نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ زبان کا آغاز ''مادے'' (Roots) سے ہوا ہے۔ وھٹنی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مختلف لسانی گروہوں کی ان گنت بولیوں کے دستاویزی حقائق اور شواہد کے محتاط استقراء سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔ نظریہ‌ٔ مادہ (Root Theory) کی مستحکم بنیاد' گرامر کے عناصر کے تاریخی ارتقا کے نظرئیے سے استنباط کی ہوئی منطقی ضرورت پر استوار ہوئی ہے اس کے نزدیک زبان جیسے وسیلے کا آغاز سیدھا سادا اور بھدا ہی سا ہو سکتا ہے جسے

مادے کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن وہ خود بھی اس نظریے سے زیادہ مطمئن نظر نہیں آتا۔ اور زبان کے آغاز سے بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہے کہ زبان کی تاریخی تحقیق سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیاگیاہے کہ تمام زبانوں کے قواعدی لوازمات تدریجی ارتقا کا نتیجہ ہیں۔ گردان اور تصریف کے اختتامیے، نیز مشتقات کے سابقے اور لاحقے بنیادی طور پر مستقل کلمے تھے' جو دوسرے کلموں کے دوش بدوش استعمال ہوتے ہوتے، ان میں گھل مل کر اپنی آزادانہ حیثیت کھو بیٹھے اور تعمیری اور قواعدی رشتوں کی محض علامت بن کر رہ گئے۔ تاریخی تحقیق لسانی تجزیے کے ذریعہ آغازِ زبان کی جس منزل تک پہنچا سکی ہے' وہ ,, مادے کی منزل ،، ہے۔ اس طرح مادے کا نظریہ وجود میں آیا' جس کی رو سے ہرقدیم زبان اپنے اولین دورِ ارتقا میں محض مادوں پر مشتمل تھی اور تجزیاتی مطالعے کے بعد زبان کے مادے یک رکنی قرار دئیے گئے۔ یہ رائے بھی ظاہر کی گئی کہ یہ مادے خارجی، صریحی اور طبیعی افعال کے صوتی اشارئیے ہوں گے لیکن ان کے مدلول سے متعلق حتمی فیصلہ ممکن نہیں۔ بعض انتہا پسندوں نے تو یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اختتامیے اور لاحقے' مادوں سے خود بخود پھوٹ نکلے ہیں۔ لیکن مادے کا نظریہ آغازِ زبان کی گتھی کو نہیں سلجھاتا۔ لسانی مادے (Root) کو نطقِ انسانی کے نقشِ اولین کی حیثیت سے پیش کرنا پیاز کے چھلکے اتارنے سے کم نہیں۔ مادے کیوں کر وجود میں آئے؟ ان کے محرکات کیا تھے؟ وہ کیوں اور کس طرح رائج ہوئے؟ ان سوالات کے تشفی بخش جوابات ممکن نہیں۔ اس لئے اس نظرئیے کی قطعیت کا دعویٰ معقول نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مادے کا تصور، قدیم سنسکرت قواعد دانوں سے اخذ کیا گیا ہے

بوپ نے ان قواعد دانوں کے زیرِ اثر مادوں کو اصلاً یک رکنی قرار دیا اور اس کے مقلدین نے مادے کے اس تصور میں کچھ اور صوتی خصوصیات کا اضافہ کردیا۔ جن الفاظ کو صوتی مماثلت کی وجہ سے اشتقاقی طور پر ہم رشتہ سمجھا جاتا ہے ان کا مشترک صوتی عنصر ہی مادہ کہلاتا ہے۔ لیکن اس طرح کے تمام مادوں کو کسی ایک دور کی تخلیق سمجھنے کا کیا جواز ہوسکتا ہے؟ ,,مادے کی منزل '' یا ,, مادوں کا دور '' جیسی ترکیبیں کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہوسکتیں۔

وھٹنے نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ تاریخی تحقیق جن حقائق سے روشناس کرادیتی ہے ان سے نئی حقیقتوں کا استنباط بھی ممکن ہے۔ لیکن اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ محدود مصدقہ معلومات سے استقراء پر ہی اکتفا کرلیا جائے۔ بلکہ زبان اور انسانی تاریخ کے معلومہ حقائق سے استقرائی تعمیم اور ان نظری شرائط سے نتائج کا استنباط مستحسن ہے۔ اس ضمن میں اختلافات کا ابھرنا بھی نا گزیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آغازِ زبان پر غور و فکر کرنے والے ماہرین تاریخی تحقیق کے ایک نتیجے یعنی مادے کے نظرئیے سے متفق ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے شدید اختلاف بھی کرتے رہے ہیں۔ زبان اور خیال کے رابطے سے متعلق جو متنازعہ فیہ مباحث پیش کئے جاتے رہے ہیں انہیں اس ذیل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس بحث سے قطع نظر کہ زبان کی مدد کے بغیر سوچنا ناممکن ہے یا زبان، خیال یا فکر کے اظہار کا محض ایک ذریعہ ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آغازِ زبان کی بحث میں ان دونوں نقطہ ہائے نظر میں بہ ظاہر مفاہمت کا امکان نہ تھا۔ نتیجتہً آغازِ زبان سے متعلق مختلف نظرئیے وجود میں آتے رہے۔ یہ سوال بھی ابھر سکتا ہے کہ

آیا "نطق" کی اولین تحریک باطنی قرار دی جا سکتی ہے یا خارجی؟ ابتدائی صوتی اشارے دل کی بھڑاس نکالنے یا وفورِ جذبات سے آسودگی پانے کی خواہش کا کرشمہ تھے یا ان سے قائل کی سوچ بچار یا خیال کا ابلاغ مقصود تھا؟۔ انہیں سیدھے سادے ذریعۂ اظہار کی حیثیت سے وجود میں لایا گیا یا ذریعہ ابلاغ کی حیثیت سے؟۔ آغازِ زبان کا محقق اس سوال کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔

زبان کسی کی انفرادی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک تہذیبی ورثہ ہے اور کسی نہ کسی معاشرے کی امانت۔ کسی بھی زبان کا کوئی عنصر کسی فرد کا کارنامہ نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اولاً اسے کسی نہ کسی فرد ہی نے تخلیق کیا ہوگا، لیکن کسی ایک فرد کی تخلیق ہی اسے زبان کا جزو نہیں بنا دیتی۔ جب تک وہ اپنی اظہاریت کی وجہ سے دوسروں کے لئے قابلِ قبول نہیں ہوتا یا دوسرے اس کا وہی مفہوم مراد لے کر، جو قائل کا مقصود تھا، خود بھی استعمال نہیں کرنے لگتے اور وہ زبان زدِ عوام نہیں ہوجاتا اس وقت تک وہ با معنے لفظ نہیں کہلاتا اور نہ ہی وہ زبان کا جزو بن سکتا ہے۔ اگرچہ افراد کے اجتہاد یا نطقی عمل ہی سے زبان میں تغیرات اور اضافے ہوتے ہیں اور وہ ارتقائی منازل طے کرتی ہے لیکن یہ تمام تبدیلیاں اور ارتقائی کیفیتیں دوسرے بولنے والوں کی قبولیت ہی کی وجہ سے مسلمہ حیثیت اختیار کرتی اور ابلاغ کا حق ادا کرتی ہیں۔ ایک لفظ کا ماخذ اور سرچشمہ کچھ بھی ہو، اس کی صوتی اور رکنی حیثیت جیسی بھی ہو، اگر باہمی افہام و تفہیم اور ابلاغ کا ذریعہ بنتا ہے تو مخصوص مفہوم کا حامل ہوجاتا ہے لفظ فی نفسہ ایک صوتی علامت ہے، جس کا مفہوم یا مدلول سے کوئی منطقی رشتہ نہیں۔ مدلول یا مفہوم تو باہمی مفاہمت کا نتیجہ

ہے اور اسی کی وجہ سے وہ زبان کا جزو سمجھا جاتا ہے۔ اگر اس پر باہمی مفاہمت نہ ہو اور اس کی ابلاغی قدر نہ ہو تو نہ وہ زبان کے بولنے والوں میں رائج ہوسکتا ہے اور نہ زبان کا جزو کہلا سکتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انسان اپنے خیالات و احساسات کے ابلاغ کے لئے زبان استعمال کرتا ہے۔ اس کی سماجی ضرورتیں اور معاشرتی جبلت اسے ناطق بناتی ہیں۔ کوئی شخص تن تنہا اور کسی دوسرے فرد سے الگ تھلگ رہ کر زبان تخلیق نہیں کرتا۔ کسی بچے کو پیدائش کے بعد ہی اس طرح پرورش کیا جائے کہ کسی دوسرے فرد کی پرچھائیں بھی نہ پڑے تو وہ سمجھ میں آنے والی کوئی زبان بولنے کے لائق نہ ہو سکے گا۔ اس کے بر عکس دو ایسے بچوں کو ساتھ ساتھ رہنے کا موقع دیجئے، جنھوں نے ابھی بولنا بالکل نہ سیکھا ہو۔ وہ باہمی ابلاغ کا کوئی نہ کوئی ذریعہ، خواہ وہ کتنا ہی بھدا کیوں نہ ہو، ضرور پیدا کرلیں گے' ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ عمل بہت ہی آہستہ ہوگا۔

بعض ماہرین لسانیات نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ چوں کہ انسان سوچتا سمجھتا ہے اس لئے وہ بولتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسانی خیالات زبان سے بالکل ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ زبان اور خیال یا فکر کے نازک رشتے سے متعلق بہت کچھ کہا جاتا رہا ہے بلکہ متضاد رایوں کا اظہار بھی کیا جاتا رہا ہے۔ ان مباحث میں الجھے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان ابھی اتنی مکمل اور جامع حیثیت اختیار نہیں کرتی کہ خیالات و افکار کی کما حقہ' نمائندگی اور ہو بہو عکاسی کرسکے۔ الفاظ اور محاورے تو خیالات کے اشارے ہوتے ہیں۔ ان کی حیثیت تو ایک ماہر اسکیچ بنانے والے کی پینسل کے نقوش سے زیادہ نہیں' ان نقوش کی معنویت اور رنگ آمیزی دوسری طبیعتوں اور اذہان کے کرشمے ہیں۔ ہم اپنے

ذہنی اعمال اور کیفیات کا خود تو تجزیہ کر سکتے ہیں ۔ لیکن یہ تجزیہ الفاظ میں بھرپور طریقے سے پیش نہیں کر پاتے ۔ کبھی کبھی قائل کی بات کا جو مفہوم سامعِ مراد لیتا ہے ۔ قائل خود بھی اس کا سان گمان نہیں رکھتا اور سامع کا مفہوم اسے زیادہ دل نشیں محسوس ہوتا ہے ۔ بعض شاعروں کے اشعار کے وہ مطالب پیدا کر لئے جاتے ہیں کہ شاعر بھی جھوم اٹھیں ۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ الفاظ، خیالات و تصورات یا مفہوم کے ہو بہو مثنی نہیں ہوتے ۔ خیالات کے تمام لطیف پہلو ، ان کی گہرائی ' بلندی ، باریکی ، نزاکت سب کی سب الفاظ کے دامن میں نہیں سمٹ آتیں ۔ تاہم الفاظ سے خیالات کو تھوڑی بہت مدد ضرور ملتی ہے ۔ فکروخیال کے ہر شعبے میں ذہن سرمایۂ زبان سے کچھ نہ کچھ ضرور اخذ کرتا ہے ۔

مندرجہ بالا مباحث کی روشنی میں یہ واضح ہوجاتا ہے کہ زبان کو محض ذریعۂ اظہار قرار دینا درست نہیں چوں کہ ابلاغی قدر کے بغیر زبان صحیح معنوں میں زبان نہیں بنتی ' اس کی ابلاغی قدر اور سماجی حیثیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ۔ اس لئے وہ اساسی طور پر ذریعۂ ابلاغ ہے اور اسی حیثیت میں وہ معرضِ وجود میں آتی اور ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے ۔

بشریاتی نقطۂ نظر سے ، سوچنے سمجھنے والی اور ناطق ہستی کے بغیر انسان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ ھمبولٹ کی رائے میں انسان زبان ہی کی وجہ سے انسان ہے ۔ انسان کے بغیر زبان معرضِ وجود میں نہیں آتی اور زبان کے بغیر انسان کا تصور ممکن نہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ بعض دوسرے جانوروں میں بھی اظہاریت اور اشاراتی آوازوں کی صورتیں بھی ملتی ہیں ' یہ اور بات ہے کہ ہم ابھی تک بعض پرندوں اور حیوانوں کی ,, زبان ,,

کی ماہئیت اور ان کی اظہاریت کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں یا چیونٹیوں کے اشاراتی نظام کو نہیں سمجھ سکے ہیں۔ تاہم کسی بھی پرندے یا حیوان کی مزعومہ زبان یا ان کا اشاراتی نظام انسانی زبان کی طرح ارتقائی منزلیں طے نہیں کر سکا ہے۔ اور ان کا تصور ناطق ہستی کی حیثیت سے نہیں ابھرتا۔ اس لئے آغاز زبان کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے بشریاتی نقطۂ نظر اختیار کرنا زیادہ مناسب ہے۔ اس ضمن میں انسان اور زبان کے غیر تغیر پذیر فرق کو پیش نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ زبان کے تخلیقی ارتقا کے بنیادی تصور کا تعین بھی ضروری ہے۔

زبان کے ما قبل تاریخ دور سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ما قبل تاریخ دور سے مراد زبان کے وہ مدارج ہیں۔ جو صحیح نطق انسانی کے وجود میں آنے سے پہلے کے ادوار سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمیں ان مختلف مدارج کی تشکیل جدید کی کوشش بھی کرنی چاہیئے۔

ہمارے خیالات پر مسلسل ارتقا کے تصور کا اتنا گہرا اثر ہے کہ زبان جیسے ترقی یافتہ تہذیبی ورثے کا علم اس وقت تک تشنہ رہے گا جب تک زبان کے آغاز کی قابل قبول توجیہ نہ ہو سکے اور ان قرین قیاس سر چشموں کی نشان دہی نہ کی جا سکے جن سے اس کا ارتقا ہوا ہے۔ لیکن اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش سے پہلے اس کے حدود اور وسعت کو بھی سمجھ لینا چاہیئے۔ آخر آغاز سے کیا مراد ہے ؟ ۔ کیا کسی مظہر یا وظیفے کے آغاز سے وہ ہئیت مراد لی جا سکتی ہے جس کے ذریعے سے اس مظہر یا وظیفے نے ابتداءً نمو پائی اور پھر ارتقائی مدارج طے کئے، یا اس ہئیت کے وجود میں آنے سے پہلے کی وہ ابتدائی حالت یا غیر متشکل مواد مراد لیا جا سکتا ہے،

جس میں کوئی ترکیبی عمل ہوا اور اس مخصوص مظہر یا وظفیے نے ایک خاص روپ دھارا اور نمو پانا شروع کیا۔ مثلاً کسی مجسمے کی تیاری کے سلسلے میں چکنی مٹی یا پلاسٹر کے خام مواد کو مجسمے کی ابتدائی حالت یا غیر متشکل مواد کہہ سکتے ہیں لیکن اسے مجسمے کی ابتدائی ہیئت قرار دینا درست نہیں جب تک یہ خام مواد ایک خاص ترکیبی عمل سے کوئی ہیئت اختیار کرنا شروع نہ کرے' خواہ وہ کتنی ہی بھدی کیوں نہ ہو' اس وقت تک یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مجسمے کا آغاز ہوگیا ہے۔ ہیئت کے اولین اظہار کو جس میں کسی مظہر یا نوع کی مابہ الامتیاز خصوصیات ہوں' اساسی ابتدائی اور قدیم ترین ہیئت قرار دے سکتے ہیں۔ ان خصوصیات کے تغیرات سے ہیئت بھی بدلتی جاتی ہے اور جب بنیادی خصوصیات بھی بدل جاتی ہیں تو نوع عبوری حالت سے گزرتی ہوئی ایک نیا روپ دھار لیتی ہے پھر اس میں تغیرات سے بوقلمونی اور رنگا رنگی تو پیدا ہوتی ہے لیکن نئی نوع اس وقت تک وجود میں نہیں آتی جب تک اس کے مابہ الامتیاز اور اساسی خصائص ختم ہو کر نئے خصائص جنم نہ لے لیں۔ اس طرح تخلیقی ارتقا کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ کسی مظہر کی ما قبل تاریخ حالت یا خام مواد میں اس کی نوع کی مابہ الامتیاز خصوصیات نہیں ہوتیں اس مظہر کے قدیم ترین یا بالکل ابتدائی دور میں ان خصوصیات میں سے چند ہی ہوتی ہیں۔ مثلا جانوروں کی جنسی دعوت دینے والی آواز بی زبان کی مابہ الامتیاز خصوصیات سے محروم ہوتی ہیں اس لئے انہیں زیادہ سے زیادہ ماقبل تاریخ حیثیت دی جا سکتی ہے۔ انہیں زبان کا ابتدائی دور قرار نہیں دے سکتے کیوں کہ وہ اس معیار پر پوری نہیں اترتیں جو زبان کو ابلاغ کی دوسری

صورتوں سے ممتاز کرتا ہے۔ وہ بنیادی وظیفے علاماتی ماہیئت، نطق، لہجے، قواعدی ساخت وغیرہ سے محروم ہوتی ہیں۔ ابلاغ کے تخلیقی ارتقا کے سلسلے میں صوتی اظہاریت کو زبان کی سابقہ حیثیت قرار دینا بھی محل نظر ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے یہ اصوات ندائیہ ہوسکتی ہیں ان کی وجہ سے اندرونی ہیجان سے چھٹکارا مل سکتا ہے لیکن گویائی اور ان میں کوئی رشتہ تلاش کرنا بے سود ہے۔ یہی حال نقل کی ہوئی آوازوں کا ہے۔ جن الفاظ کے ذریعے سے فطرت کی آوازوں کی نقالی کی جاتی ہے وہ بہ ظاہر ان کے صحیح ترجمان محسوس ہوتے ہیں، لیکن ان دونوں میں کسی مشترک رجحان، اور مقصد کو ڈھونڈ نکالنا مشکل ہے' اس لئے ان الفاظ یا اصوات کو زبان کی سابقہ حیثیت دینا درست نہیں ہوسکتا۔ اظہار کی ایسی صورتیں جن کا زبان کی ابتدائی تشکیل میں اچھا خاصا حصہ ہے، نظر انداز نہیں کی جا سکتیں' لیکن ان میں اور زبان کی اولین با مقصد اور با معنی نطقی صورت میں تمیز کرنا بھی ضروری ہے۔ کچھ نظریے مثلاً نقالی کا نظریہ، یا حرکاتی نظریہ' در اصل ما قبل زبان دور سے تعلق رکھتا ہے۔ جن نظریوں کی بنیاد بچوں کی نفسیات یا نسلیات پر ہے وہ زبان کی قدیم ترین اور ابتدائی حیثیت سے متعلق ہیں۔ ارتقائی نظریہ جس کے ذریعے سے زبان کی بلند لسانیاتی سطح کو پست سطح سے اخذ کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے، ما قبل لسانی حیثیت کی تشکیل جدید کو درخور اعتنا نہیں سمجھتا۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ اظہار کی ان صورتوں کی تمیز اور انکا تعین مشکل ہے' جو باقاعدہ زبان کی پیش رو رہ چکی ہیں، تاہم ان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

یورپ میں ،، علم اللسان ، کے ارتقا سے پہلے اٹھارویں صدی عیسوی تک آغازِ زبان کا الہیاتی نظریہ کسی نہ کسی صورت میں عام رہا ہے۔ مذہبی نقطۂ نظر سے انسانی زبان کو تخلیقِ ربانی سمجھنے کا عام رجحان دنیا کے اکثر ممالک میں رہا ہے جرمن مفکر **ھرڈر** نے غالباً پہلی بار اس عقیدے پر اعتراض کیا۔ اس نے اپنے ایک مضمون ،، زبان کا آغاز ،، (۱۷۷۲ء) میں یہ قلم بند کیا کہ اگر زبان تخلیق ربانی ہوتی تو وہ زیادہ منطقی، منظم جامع اور بلیغ ہوتی انسانی زبانوں میں جو بے قاعدگی، بے ڈھنگاپن اور تشنگی ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ زبان انسان ہی کا کرشمہ ہے۔ وہ انسان کی ایجاد نہیں، ارادی طور پر تشکیل نہیں دی گئی، بلکہ حسبِ ضرورت انسان کے نہاں خانۂ باطنی سے ابھری ہے۔ جس طرح بچہ رحمِ مادر سے نکلنے کے لئے زور لگاتا ہے اسی طرح زبان کا جنین ظہور پانے کے لئے زور مارتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب قدیم ترین انسان کے دل میں کسی بکری کو دیکھنے سے مختلف

تاثرات اور احساسات کی لہریں پیدا ہوئیں اس نے ان میں سے کسی ایک کو منفرد کرلیا اور بکری کی مابہ الامتیاز خصوصیت ,, ممیانے،، سے واقف ہوا اور پھر بکری کو ممیانے کی نقل سے تعبیر کیا، اس طرح ایک جانور کا نام وجود میں آگیا۔ گویا اس نے فعل سے اسم پیدا کیا۔ اس طرح زبان کا آغاز افعال سے ہوا۔ اگر زبان تخلیق ربانی ہوتی تو اس کا آغاز اسموں سے ہوتا۔ گویا **ھرڈر** نے آغاز زبان کا Onomato Poetic نظریہ پیش کیا۔

اکثر مفکرین ماہرین لسانیات نے قدیم ترین دور کا تصور کرکے یہ قیاس کیا ہے کہ زبان سے محروم انسان نے اپنے خیالات کے ابلاغ کے لئے نطقی وسیلہ کس طرح اختیار کیا ہوگا اور کس طرح انسانی زبان وجود میں آئی ہوگی - اٹھارویں صدی میں **روسو** نے زبان کے فطری آغاز کے مسئلے سے بحث کی ہے اور یہ تصور پیش کیا ہے کہ ابتدائی انسانوں نے کم و بیش اسی طرح کے مفاہمانہ انداز میں زبان تشکیل کی، جو تمام عمرانی نظاموں کی بنیاد ہے۔ لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ زبان سے محروم قدیم ترین انسانوں کے یکجا ہو کر اتفاق رائے کرنے کے محرکات اور وسائل کیا ہوسکتے تھے اور وہ اس بات پر کیسے متفق ہوسکے ہوں گے کہ کون سی آواز کس خیال کی ترجمان سمجھی جائے -

کونڈلِ لک (Condillac) نے یہ تصور پیش کیا ہے کہ زبان سے محروم مرد اور عورت کی جذباتی آوازوں اور تائیدی حرکات و سکنات نے بتدریج ابلاغی قدر پائی اور ان کی اولاد نے ان آوازوں اور ان سے ملتی جلتی آوازوں کو زیادہ آسانی سے ادا کرنا شروع کیا' تو انہوں نے اپنی سمجھ کے مطابق ان سے کچھ نہ کچھ مطلب اخذ کیا اور آہستہ آہستہ ان آوازوں کے مفاہیم متعین ہوتے گئے اور پھر انہوں نے خود بھی انہی آوازوں کو ادا کرنا شروع کردیا

اس طرح ہر نسل نئی نئی صوتی ترکیبوں یا لفظوں کا اضافہ کرتی رہی اور سالہا سال کی ایسی کاوش کے بعد ایک زبان تشکیل پا گئی

جرمن ماہرِ لسانیات ڈبلیو-ایچ-جے-بلیک (W. H J. Bleek) نے جو نظریہ پیش کیا ہے اسے Simious Theory کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے - اس کی رائے میں قدیم ترین ظاہری انسانی وجود نے مخصوص احساسات و جذبات کے اظہار کے لئے مخصوص صوتی اشارے ادا کئے ' اس کے دوسرے ہم جنس بندروں کی طرح نقالی کی خاصیت رکھتے تھے - اس لئے انہوں نے ان آوازوں کی نقالی کی اس نقالی نے ان احساسات و جذبات کی یاد تازہ کردی جو ان کے اپنے صوتی اشاروں کے محرک ہوچکے تھے - اس کے ذریعے سے انہیں احساسات اور ان کے فطری اظہار کا اندازہ ہوا اور دلالت اور مدلول کے معمولی سے شعور نے انگڑائی لی - اس طرح بتدریج دلالت اور مدلول اسم اور مسمی کی ایک دوسرے سے علاحدگی اور باہمی تعلق کا شعور پختہ ہوتا گیا اور انسانی وجود فی الواقع انسان بن گیا اس نظرئیے پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ جب تک جذبے یا احساس کا اظہار کرنے والے صوتی اشارے کا تلازمہ احساس کے ساتھ نہ ہو سکے اس وقت تک اس کی نقل اتارنے کی ضرورت کیسے پڑ سکتی ہے - اگر قدیم ترین انسان میں وہ سوجھ بوجھ نہ ہوتی ' جو اسے جانوروں سے ممیز کرتی ہے ، تو کیا سماعت اور نقل کا ملکہ اسے ناطق اور با شعور انسان کہلانے کی منزل پر فائز کرسکتا تھا ؟ - ہرگز نہیں — سوجھ بوجھ کا یہی ملکہ جو ارتقا پا کر عقل و شعور کہلایا ' انسان کی مابہ الامتیاز خصوصیات اور یہی انسان کے تہذیبی ارتقا کا سبب بھی ہے -

شلیخر نے زبان کاجو طبیعی نظریہ پیش کیا ہے' اس کے ذیل میں زبان کے آغاز سے متعلق بھی بعض اشارے کئے ہیں - تقابلی ،

لسانیات کی تاریخ میں **شلیخر** کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ زبان کے تاریخی مطالعے کے ارتقا میں اس کا جو اہم کردار ہے اسے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ اس نے تقابلی لسانیات کے عالم کی حیثیت سے قابلِ قدر کارنامے سر انجام دیئے ہیں لیکن فلسفۂ لسان کے ذیل میں اس نے جن آراء کا اظہار کیا ہے، ان میں بہت سے سخن گسترانہ موقعے نکلتے ہیں۔ اس نے اپنے رسالے ''ڈارون کا نظریہ اور علم اللسان'' میں زبان سے متعلق وہی نتائج مرتب کئے ہیں جو **ڈارون** نے حیوانی زندگی کی تاریخ سے متعلق اخذ کئے تھے۔ اس کے نزدیک زبانیں فطری اجسامِ نامی ہیں' جو انسانی قصد و ارادہ سے تشکیل نہیں پاتیں بلکہ معینہ قوانین کے ماتحت خود بہ خود پیدا ہوتی ہیں' ارتقا پاتی ہیں بوڑھی ہوتی ہیں اور مر جاتی ہیں۔ ان سے مدرکات کا وہ تواتر و تسلسل متعلق ہوتا ہے جسے ''زندگی'' کہا جاتا ہے۔ انسان حیوانی زندگی کی نچلی سطح سے بتدریج انسان زبان کے تدریجی ارتقا کی وجہ سے بن گیا۔ تمام زبانوں کا ناطہ کسی ایک اسانی سرچشمہ سے جوڑنا ممکن نہیں ہے زبانوں کے جتنے خاندان ہیں' اتنے ہی لسانی سر چشمے ہیں۔ زبانوں کے ابتدائی اختلافات جغرافیائی ہوتے ہیں۔'' لیکن وہ زبان کی ابتدائی منزل ''مادے کی منزل'' بھی قرار دیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ مخصوص مادے مختلف لسانی خاندانوں کے ارتقا کے موجب بھی ہوسکتے ہیں **شلیخر** نے اپنے اس دعوے کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا ہے کہ زبان معینہ قوانین کے ماتحت خود بہ خود پیدا ہوتی ہے اور زبان کے ارتقا کا انسانی جسم کے ارتقا سے کوئی لازمی اور منطقی تعلق ہے۔ ہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زبان کے ارتقا نے تعلق انسان کے دورِ وحشت سے تہذیب و تمدن کی طرف

سفر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ایک اور جرمن ماہر لسانیات Hajjein Steinhal اپنی کتاب ,, گرامر ، منطق ، نفسیات ،، کے مقدمے کے پانچویں باب میں ,, آغازِ زبان '' سے بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہے کہ ,, گرامر کے اصول دریافت کرنے کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ زبان کی بنیادی خصوصیت ، ذہنی عمل سے اس کے گوناگوں رابطوں ، ذہنی کفایت و تقلیل میں اس کے کردار اور ذہنی ارتقا کے سلسلے میں اس کی کارکردگی کا کما حقہ ، تحقیقی جائزہ لیا جائے لیکن یہ تحقیقی جائزہ ، آغازِ زبان کی تحقیق ہی سے شروع ہو سکتا ہے ''۔ اس طرح اس نے عام ماہرینِ لسانیات کے بر عکس ,, آغازِ زبان ،، کے مسئلے ہی سے اپنے تحقیقی سفر کا آغاز کیا اس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ میرے نزدیک آغازِ زبان کی تحقیق اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ ہم اس ذہنی کلچر سے پوری واقفیت حاصل کریں جو تخلیقِ زبان کا پیش خیمہ ہے اور شعور کی خصوصی کیفیت ، اس کے مخصوص روابط و متعلقات اور ان شرائط کو اچھی طرح سمجھ لیں جن کے ماتحت زبان وجود میں آتی ہے یہ دیکھیں کہ ذہن اس کے ذریعے سے کیا کچھ حاصل کرتا ہے اور معینہ قانون کے ماتحت کس طرح ارتقا پاتا ہے ۔ ذہنی حالت اور شعور کے رابطے ہی در اصل وہ فعال قوتیں ہیں جو زبان تخلیق کرتی ہیں ۔ ذہنی کلچر کی کیفیت اور شعور کے قوانین الفاظ پیدا کرتے ہیں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زبان ایجاد نہیں بلکہ ذہن کے اندر ایک تخلیق ہے ۔ وہ ایسا کام نہیں ہے جس کے لئے سوجھ بوجھ نے ذرائع مہیا کئے ہوں ۔ اسے نہ شعوری ضرورت کی تکمیل کے لئے ، معلومہ ذریعے کا ارادی اطلاق قرار دے سکتے ہیں اور نہ ذہنی وظائف کی کارکردگی بڑھانے کا

شعوری وسیلہ۔ اسے وجود میں لانے کا ارادہ نہیں کیا گیا بلکہ وہ اس کے بغیر وجود میں آگئی۔ لاشعور میں رہنے والے وہ قوانین جو شعور کے عناصرِ ترکیبی پر حکم رانی کرتے ہیں، عمل میں آتے ہیں اور زبان کی تخلیق کے موجب ہوتے ہیں۔ Sfienhai بچوں کے نطقِ گویائی کی مثال بھی پیش کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ بچوں کو بولنا کون سکھاتا ہے؟۔ ننھے ننھے بچے خود ہی اچانک بولنے لگتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی موقع پر کچھ الفاظ کو گرفت میں لے لیتے ہیں اور گرفت میں لے لینا تخلیق کرنے سے کم نہیں۔ مالی پودے اگانے کے سلسلے میں بیج کے ساتھ جو عمل کرتا ہے وہی کچھ ہم بچوں کو ناطق بنانے کے لئے کرتے ہیں اور سماج میں ذہنی بالیدگی کے ضروری شرائط مہیا کردیتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ہم جتنا بولنا سیکھتے ہیں اس سے زیادہ سمجھنا سیکھتے ہیں۔ قدیم انسان زبان کو وجود میں نہیں لایا، نہ بعد کی نسلوں کے بچوں نے زبان کو تخلیق کیا بلکہ زبان خود بہ خود جنم لیتی اور پھلتی پھولتی ہے۔ جب وہ جنم لے لیتی ہے تو انسان اس کو سمجھنا سیکھتا ہے قدیم ترین سماج کے قدیم ترین انسان نے بعد کی نسلوں کے بچوں کی طرح بولنا نہیں بلکہ سمجھنا سیکھا۔ اس نے اس زبان کو سیکھا جو خود بہ خود جنم لے رہی تھی۔ بچوں نے پچھلی نسلوں کی ترقی یافتہ زبانوں کو سمجھنا سیکھا۔ جس طرح بچے سیکھی جانے والی زبان کے خالق نہیں ہوتے اسی طرح قدیم انسان نے جس زبان کو سیکھا اس کا خالق نہیں تھا۔ قدیم ترین زبان تو سماج کی روح سے پیدا ہوئی تھی۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسان نے شعوری طور پر زبان کو بہ حیثیت زبان کے تخلیق کرنے کی کوشش

Acc. No 8763

نہیں کی اور نہ ہی ذہنی کارکردگی میں ارادی طور پر اضافہ کرنے کے لئے اس نے زبان کو پیدا کیا۔ زبان کی حیثیت تو اور دوسرے تہذیبی اکتسابات کی سی ہے۔ جس پہلے انسان نے کسی درندے کے حملے سے بچنے کے لئے اس کا سر کسی لکڑی یا پتھر سے کچل دیا ہوگا اسے یہ شعور کہاں ہوگا کہ وہ جس عمل کا مرتکب ہو رہا ہے وہ بتدریج ترقی کرکے ایسے بہت سے اعمال کا موجب بن جائے گا جن کی بدولت وہ فطرت کا غلام رہنے کے بجائے اس پر قابو پاتا جائے گا، اور اس کا معمولی سا ڈنڈا، تلوار، برچھی، نیزہ اور پھر بندوق، رائفل کی ترقی یافتہ صورتوں کو ایجاد کرنے کا سبب بھی بن جائے گا۔ وقتی اور ہنگامی سہولت بخشنے والے معمولی سے ہتھیار کو مہیا کرنے والی صلاحیت انجن، بجلی، راکٹ بھی ایجاد کر لے گی اور ایٹمی توانائی دریافت کرکے اس سے محیر العقول کام لے گی۔ اسے تلازماتی قوانین اور ذہن کی اس تخلیقی صلاحیت کا بھی شعور نہ ہوگا جس نے اس اولین فطری ہتھیار سے کام لینا سکھادیا جو اس کے ہاتھوں کے مقابلے پر زیادہ موثر ثابت ہوا۔ اسی طرح انسان نے شعوری طور پر یا زبان کی تخلیق کی نیت سے زبان کی تشکیل نہیں کی بلکہ ابتدائی انفرادی اور سماجی تقاضے بعض صوتی اشاروں کی تخلیق کے موجب ہوئے اور یہ صوتی اشارے ابلاغ کا مقصد پورے کرتے رہے تو نطقی روایت بن کر تہذیبی روایت بنتے گئے اور اس روایت میں بتدریج نت نئے اضافے ہوتے رہے، زبان کے مضمرات بعد میں سمجھ میں آئے۔

اسٹین ہل کا یہ خیال صحیح ہے کہ زبان پاؤڈر یا بارو.کی طرح مرئی چیز نہیں بلکہ ایک ,,وقوعہ،، ہے دھماکے کی طرح وہ آنکھ کان وغیرہ کی طرح جسمانی اعضا، یا عضلات بھی نہیں بلکہ صلاحیت یا عمل ہے جیسے دیکھنا یا سننا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دیکھنے یا

سننے میں لازماً ارادے کا دخل نہیں ہوتا اور بولنے میں ارادے کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ لیکن اس کی یہ رائے کہ ذہنی حالت اور شعور کے رابطے ہی کی فعالی زبان تخلیق کرتی ہے ٹھیک نہیں زبان مدرکات کی منطوقہ علامت ہے اور صوتی اشاروں کا مجموعہ' اعضائے نطق سے پیدا شدہ صوتی ارتعاشات کا تسلسل ہے جنہیں اعضائے سماعت کی مدد سے گرفت میں لیا جاتا ہے۔ نطق' اور سماعت دونوں کے پس پشت نفسیاتی کارفرمائی سے انکار ممکن نہیں لیکن زبان کی تخلیق کی اہم فعال قوتیں' پھیپھڑے' حلقوم' تالو' جیبھ' لہات' دانت' ہونٹ پھیپھڑوں اور حلقوم سے خارج ہونے والی ہوائی لہریں جن سے صوتی اشارے تشکیل پاتے ہیں' ذہن کے اجزائے ترکیبی نہیں کہلا سکتے ذہن کی فوری پیداوار تو ادراک' احساس' فیصلہ وغیرہ ہیں۔

تاریخ لسانیات میں آغاز زبان کے کچھ نظرئیے اچھے بگڑے ہوئے ناموں سے یاد کئے جاتے رہے ہیں مثلاً بھوں بھوں یا بووو Bow - Wow Theory پوہ' پوہ Pooh - Pooh Theory ڈنگ ڈانگ Ding Dong اور یو - ہی - ہو Yo-he-ho Theory وغیرہ۔ ان سب میں زبان سے محروم ابتدائی انسان کا تصور کرکے یہ قیاس کیا گیا ہے کہ انسان نے بولنا کس طرح شروع کیا۔

پہلے نظرئیے کی رو سے انسان نے کتے کے بھونکنے' بکری کے ممیانے اور بعض دوسرے جانوروں کی مخصوص آوازوں کی نقالی سے ان جانوروں کو تعبیر کیا اور اس طرح ابتدائی فطری کلمات وجود میں آگئے۔ گویا حیوانات اور بعض دوسرے مظاہر کی آوازوں کی رہبری سے اسمائے اصوات پیدا ہوئے۔ اس نظرئیے کو حکائی (اصواتی) Onomatopoetic بھی کہا جاتا ہے۔

دوسرے نظرئیے کو فجائیہ نظریہ بھی کہا جاتا ہے' جس

کی رو سے زبان ان جذباتی آوازوں سے اخذ ہوئی ہے جو شدتِ احساس یا درد کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس نظرئیے کے علمبرداروں کی نظریں جذباتی آوازوں ہی پر رہی ہیں۔ انھوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ یہ آوازیں کس طرح وجود میں آتی ہیں۔ **ڈارون** نے کچھ فجائیہ آوازوں کی عضویاتی توجیہات پیش کی ہیں۔ بنفے کی رائے میں فجائیہ آوازوں اور کلمات کے درمیان بعد المشرقین ہے۔ فجائیہ آوازیں اس وقت استعمال ہوتی ہیں جب انسان بول نہیں سکتا۔ فجائیہ آوازیں تو اچانک ہیجان اور جذبہ کے اضطراری اظہار کی صورتیں ہیں، جن میں عموماً ایسی اصوات استعمال ہوتی ہیں، جو زبان کی عام اصوات سے کچھ مختلف ہوتی ہیں مثلاً غیر مصیت مصوتے۔ یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ اکثر زبانوں میں استعمال کی جانے والی فجائیہ آوازیں روایتی حیثیت اختیار کر چکی ہیں اور انھیں دوسرے کلمات کی طرح سیکھا جاتا ہے، اسی لئے مختلف زبانوں میں ان کی ہیئتیں مختلف ہیں —

میکس ملر نے مندرجہ بالا حکائی اور فجائیہ نظریوں پر کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ غالباً اسی نے پہلی بار انھیں حقارتاً بو۔ وو نظریہ اور پوہ پوہ نظریہ قرار دیا تھا۔ اس کے نزدیک حکائی نظریہ اسی وقت تک ٹھیک نظر آتا ہے جب تک اس کا اطلاق کسی مرغی خانے میں مرغیوں کے کٹکٹانے پر کیا جائے لیکن مرغی خانے کے چاروں طرف اونچی دیواریں ہوتی ہیں اور ان دیواروں کے باہر ہی زبان شروع ہوتی ہے۔ اس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ تمام مظاہر فطرت میں ایک قانون جاری وساری ہے۔ وہ یہ کہ جس چیز پر بھی ضرب لگائی جاتی ہے وہ بج اٹھتی ہے۔ اور ہر چز کے بجنے سے ایک مخصوص اور اچھوتی کھنک سی ہوتی ہے۔ انسان جو فطرت کا شاہکار ہے

اس کی بھی ایک خصوصیت یہی ہے۔ اسے اپنے مدرکات اور تصورات کے نطقی اظہار کا فطری ملکہ حاصل ہے۔ دماغ کے ذریعہ ہی یہ ملکہ متحرک ہوتا ہے اور صوتی اظہار کی صورت پیدا کرتا ہے۔ باہر سے مرتسم ہونے والا ہر تاثر باطن سے صوتی اظہار پاتا ہے۔ گویا صوت اور مفہوم میں ایک باطنی ہم آہنگی ہوتی ہے۔ اس نظرئیے کو ِڈنگ ڈانگ کا نظریہ کہا جاتا ہے۔ بعد میں **میکس ملر** نے خود ہی اس نظرئیے کو ترک کردیا۔

چوتھا نظریہ جسے عرفِ عام میں ،، یو۔ ہی۔ ہو ،، کہا جاتا ہے' یہ ہے کہ بہت زیادہ اعصابی کوششوں کے دوران نظام جسم کو اسی وقت آرام ملتا ہے جب سانس زور زور سے اور مسلسل لی جائے اور اس طریقے سے لہات کو مختلف طور پر مرتعش ہونے دیا جائے۔ جب قدیم انسان اپنے ابتدائی کام سرانجام دیتا ہوگا تو اعصابی تناؤ سے نجات پانے کے لئے اس کی مسلسل اور زور زور کی سانس لہات کو مرتعش کر کے مختلف آوازیں پیدا کرتی ہوگی اور یہ آوازیں انسان کے کام سے مستلزم ہوتی گئیں اور اس طرح اس کام کے لئے ایک اسم وجود میں آگیا۔ اس طرح بہت سے بامعنے کلمے جنم لیتے رہے اور زبان بننی شروع ہوگئی۔ اس نظرئیے کے علم بردار **نوئرے** نے صوتی نقالی کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔ یہ نظریہ اول الذکر دو نظریوں کے مقابلے پر کوئی مقبولیت حاصل نہیں کر سکا۔

حکائی اور فجائیہ نظریوں کی بعض خامیوں کے باوجود انہیں یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زبان کے آغاز سے متعلق انہیں حتمی تسلیم کرنا ممکن نہیں۔ انسان کا ابتدائی کلمہ بھوں بھوں میں میں ہو یا اف، اف، یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح

کے کلمات زبان کے اجزا ضرور ہیں، یہ اور بات ہے کہ ان اجزا کو بنیادی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ انسان کی مختلف زبانوں میں صوتی رمزیت کی کارفرمائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بہت سے کلمے مظاہرِ فطرت کی نمایاں آوازوں کی براہ راست نقالی کا کرشمہ ہیں۔ چوں کہ ہمارے اعضائے نطق ان آوازوں کی ہو بہو نقالی نہیں کرسکتے اس لئے ان کی نقالی کے لئے نطقی آواز کا انتخاب اتفاقی ہوتا ہے اور اسی لئے مختلف قوموں میں مختلف صوتی ترکیبیں استعمال ہونے لگتی ہیں۔ مثلاً مرغے کی بانگ اردو، ہندی وغیرہ میں ککڑوں کو فارسی میں قوقو لیقو۔ انگریزی میں Cock-a-doodle-do، سوئیڈش میں Kukcliku، فرانسیسی میں Coquellico ڈینش میں Kykeliky سے تعبیر کی جاتی ہے۔ حرکت کا اظہار بھی حرکت سے پیدا ہونے والی آواز کی نقالی سے کیا جاتا ہے اور یہ نقالی، حرکت کی نطقی تعبیر بن جاتی ہے۔ مثلاً ہوا کی سر سراہٹ، بادل کی گڑگڑاہٹ، برتن کی کھنک، وغیرہ۔ بعض آوازوں میں ایسی اظہاریت محسوس ہوتی ہے کہ کلمے کے ساتھ ہی مفہوم سامنے آجاتا ہے گویا آواز اور مفہوم میں باطنی ربط ہے۔ لیکن اس طرح کے کلمے بھی حرکت کی ہو بہو نطقی تعبیر نہیں ہوتے، بلکہ ہر زبان میں جزوی اختلافات کے ساتھ رائج ہوتے ہیں بہت سے کلمے ابتدا میں ان اصوات کے اتنے اچھے مظہر نہیں ہوتے جتنے بعد میں سمجھے جاتے ہیں کثرتِ استعمال سے ان میں زیادہ سے زیادہ اظہاریت پیدا ہوجاتی ہے — مولوی سید احمد دہلوی نے اپنی کتاب ,, علم اللسان ،، میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہر ایک حرف اپنی اصلی صوت، اصلی مادہ، اور لغوی معنی سے، حرکات و سکنات، کنایات اور مختلف صورتوں کے بدل جانے پر بھی جدا نہیں ہوسکتا یعنی

وہ اپنی ہیئت اولیٰ کو برابر ظاہر کئے جاتا ہے اس سلسلے میں ,, گھ ،، کی صوتی رمزیت سے بحث کی ہے اور اس مادے کے بہت سے الفاظ مثال میں پیش کئے ہیں۔ مادہ ,, بھ ،، کے متعلق بھی یہی کچھ کہاجاسکتا ہے — جس طرح ,, گھ ،، سے گہرائی' نشیب پستی کثرت وغیرہ کومنسوب کر کے گھگ' گھرا گھونسا' گھڑگھڑ گھڑگھڑاہٹ گھمسان' گھنگھور گھٹا' گھورا وغیرہ کی مثالیں دی جا سکتی ہیں اسی طرح ,, بھ '' سے جلن تپش' چمک' گرمی وغیرہ کو نسبت دے کر بھاڑ' بھٹی' بھٹا' بھڑک وغیرہ مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں — لیکن صوت و مفہوم کے باہمی آہنگ اور باطنی ربط کو ایک کلیے کی حیثیت دینا کسی طرح بھی درست نہیں— بہت سے کلمے شروع شروع میں اپنے مفاہیم سے باطنی ربط نہیں رکھتے بلکہ ان کے مفاہیم' سماجی افہام و تفہیم کے نتائج ہوتے ہیں — رفتہ رفتہ عام استعمال سے ان میں اظہاریت محسوس ہونے لگتی ہے اس کے بر عکس یہ بھی ممکن ہے کہ بعض کلمات کی اظہاریت رفتہ رفتہ کم ہوتی جائے —

آٹو یسپرسن نے آغاز زبان کی تحقیق کے سلسلے میں اس قیاسی طریقے کے مقابلے پر تین مناہج بتائے ہیں' جن کی بنیادیں (۱) بچوں کی زبان (۲) قدیم ترین نسلوں کی زبان اور (۳) تاریخ زبان پر استوار ہو سکتی ہیں — وہ رقم طراز ہے کہ ,, کچھ ماہرین حیاتیات کی رائے میں فرد کی نشو و نما مجموعی طور پر انہی خطوط پر ہوتی ہے جن پر پوری نسل کی ہوتی رہی ہے — جنین اپنی پختگی اور بلوغت سے پہلے ارتقا کے انہی مدارج سے گذرتا ہے' جن سے اس نوع کی ان گنت نسلیں گذرتی رہی ہیں اور موجودہ حیاتیاتی سطح تک پہنچی ہیں۔ اس لئے بعض ماہرین نے یہ خیال کیا کہ نطق انسانی کے اکتساب کا عکس ان مناہج میں دیکھا جا سکتا ہے جن کی بدولت

بچہ ابتدائی ابلاغ کی صورتیں سیکھتا ہے اور قدیم ترین زبانوں کی تشکیل کے مختلف مدارج کی متوازی مثالیں بچوں کی زبانوں میں تلاش بھی کیں۔ لیکن انھوں نے یہ بھلا دیا کہ وہ بچوں کی سیکھی جانے والی اس زبان سے مثالیں تلاش کرتے رہے ہیں، جو پہلے سے واقعی موجود رہی ہے۔ جدید دور میں ایک باقاعدہ اور مکمل زبان سیکھنے والے بچے اور اس قدیم ترین انسان کی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے، جس کے سامنے زبان کا کسی قسم کا کوئی نمونہ ہی نہ ہو۔ بچہ تو دوسروں کی زبان سے مختلف آوازیں سنتا اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور انہی کو باہم ربط دینے کی کوشش کرتا ہے اور آہستہ آہستہ پہلے سے موجود زبان کو سمجھنا اور بولنا سیکھ لیتا ہے کوئی نئی زبان تخلیق نہیں کرتا۔ ہاں بچے کی عمر کے پہلے سال میں جو بچگانی زبان ابھرتی ہے، وہ قابلِ توجہ ضرور ہے۔ اس دوران بچے کی بے مقصد غوں غاں پر ماحول میں بولی جانے والی زبان کا اثر نہیں پڑتا، اس لئے اس کی غوں غاں فطری آوازیں سمجھی جا سکتی ہیں۔ اور ان میں پوری نسل کی زبان کا بچپن منعکس ہو سکتا ہے۔ بچے ایسے نئے الفاظ بھی تخلیق کر لیتے ہیں جنھیں پہلے کسی نے نہ سنا ہو اور وہ بعض بے معنی آوازوں کو مفہوم سے بھی آشنا کر دیتے ہیں۔ بچوں کا یہ عمل بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا،،۔

،، موجودہ دور کے غیر متمدن اور وحشی قبائل کی زبانوں کو بھی قدیم ترین زبانوں کا نمونہ قرار دیا جاتا ہے اور ان کی لسانی سطح کو قدیم ترین بول چال سے نزدیک تر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ بھلا دیا جاتا ہے کہ پسماندہ ترین قوموں کی زبانوں کی موجودہ سطح بھی سالہا سال کے ارتقا کا نتیجہ ہے یہ اور بات ہے کہ یہ ارتقا بہت سست رہا ہے اس لئے انہیں

قدیم ترین بول چال کے متوازی نہیں سمجھا جا سکتا،،۔

،، تاریخ زبان کی مدد سے آغازِ زبان کا کھوج لگانا زیادہ مناسب ہے۔ تاریخی مطالعہ ہمیں ماضی میں بہت دور تک لے جا سکتا ہے۔ دور بہ دور کے لسانی شواہد کے تقابل سے لسانی ارتقا کے اصول دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ ان اصول کی روشنی میں زبان کے ان ادوار کی لسانی حیثیت کی تشکیل جدید ہو سکتی ہے' جن ادوار کے نمونے ناپید ہیں' اس طرح الٹے قدموں ان منزلوں تک پہنچ سکتے ہیں جب زبان کا آغاز ہوا ہوگا۔ تمام زبانوں کی لسانی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ زبانیں پیچیدگی سے سادگی کی طرف سفر کرتی رہی ہیں۔ ہر زبان کا رجحان تسہیلی رہا ہے۔ آوازوں کی ایسی ترکیبیں جن کی ادائیگی میں اعضائے نطق کو دقت ہوتی تھی آہستہ آہستہ مخفف ہوتی گئیں۔ تلفظ نقرہ' لہجہ زور' آہنگ سب میں تسہیلی رجحان ملتا ہے۔ ہر زبان کی پیچیدہ ساخت اور الجھے ہوئے کینڈے نے بھی بتدریج سادگی اختیار کی ہے۔ معنوی ابہام اور معنوی کثرت کی جگہ وضاحت اور معنوی قطعیت کو ملتی رہی ہے۔ اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ قدیم ترین زبانوں کی اکائیاں معنی کے اعتبار سے انتہائی پیچیدہ اور صوتی لحاظ سے بہت زیادہ طویل ہوتی ہوں گی۔ یہی نہیں بلکہ قدیم زبانوں میں ناہمواری اور بے ربطی بھی عام رہی ہوگی۔ آج بھی وحشی قبائل کی زبانوں میں یہی سب عیب ملتے ہیں۔ ان میں متعلقہ ثقافت کی مادی اشیاء سے متعلق تو کلمات ہوتے ہیں لیکن تجرید کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ ان زبانوں پر سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انسان کی ابتدائی زبان جذبات کی مظہر رہی ہے، قدیم ترین انسان کے جذبات میں صنفی میلان کو تقدم حاصل رہا ہوگا۔ صنفِ مخالف کی توجہ

مرکوز کرنے کے لئے جذبات کے صوتی * بلکہ غنائی اظہار کا سہارا لیا گیا ہوگا ' اور جذباتی ,' ٹول " وجود میں آئے ہوں گے ان جذباتی بولوں نے ابتدائی گیتوں کو جنم دیا ' ایسے گیتوں کو جو جنسی جذبات ' مسرت اور سر خوشی کے مظہر ہوں گے۔ یسپرسن کی رائے میں ان گیتوں کے اکثر بول اپنی رکنی حیثیت کے اعتبار سے محض غنائی تھے ' اکثر صوتی ارکان آہنگ تو پیدا کرتے تھے لیکن کسی قسم کی معنویت سے عاری تھے۔ ان کے خالقوں کو یہ گمان بھی نہ ہوگا کہ وہ ان غنائی مرکب آوازوں کے ذریعے نطقِ انسانی کے لئے راہیں ہموار کر رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ اور ان سے ملتی جلتی غنائی ترکیبیں' مختلف افراد اور ان کے مختلف اعمال کی ترجمانی کے لئے بھی استعمال ہونے لگیں اور مدتِ مدید کے تجربوں نے ان میں ابلاغی قدر بھی پیدا کردی۔ مرکب بسیط آوازیں بڑے بڑے مفاہیم کے ابلاغ کے لئے استعمال ہونے لگیں ' عموماً مادی وجودوں اور ابتدائی روز مرہ زندگی کے اعمال کے لئے استعمال ہونے والی بسیط اور پیچیدہ آوازیں ابلاغی قدر سے متصف ہو کر زبان کی اولین منزل میں داخل ہوگئیں۔ اس طرح کثیر المعنی مرکب دلالتوں کے لئے نطقی وسیلہ پیدا ہوگیا۔ گویا نطقِ انسانی نے غنا کی منزل سے اپنے سفر کا آغاز کیا اور مرکب پیچیدہ بسیط آوازوں کے تسلسل سے زبان کی ابتدا ہوئی۔ صوتی و معنوی اکائیوں میں تقسیم اور منفرد کلمات کے تصور کا مرحلہ بہت بعد میں طے کیا گیا۔

جرمن ماہر نفسیات اور لسانیات G Revesz نے آغازِ زبان کے تمام اہم نظریات کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے (۱) حیاتیاتی نظریات (۲) بشریاتی نظریات اور (۳) فلسفیانہ اور الہیاتی نظریات۔ اس نے حیاتیاتی نظریات کے ذیل میں دلالتِ وضع

کرنے والے اشارات و حرکات اور جانوروں کی آوازوں سے متعلق لسانی نظریوں سے بحث کی ہے۔ وہ رقم طراز ہے کہ بعض حرکات و اشارات اور اصوات میں اظہاریت ہوتی ہے، اس لئے بعض ماہرین لسانیات نے انہیں زبان کا نقطۂ آغاز قرار دیا ہے۔ ایسے اشارے بنیادی طور پر حیاتیاتی ہی ہوتے ہیں اس لئے اس نظرئیے کو حیاتیاتی کہا جا سکتا ہے۔ فجائیہ نظریہ بھی در اصل حیاتیاتی ہی ہے۔ اس نظرئیے کی تائید میں یہ کہا جاتا رہا ہے کہ انسان اپنی بول چال میں غیر شعوری اور اضطراری حرکات و اشارات سے بھی مدد لیتا ہے، کبھی صوتی اظہار کے بجائے صرف اشارات و حرکات پر اکتفا کرتا ہے، اور کبھی مسلمہ کلمات کی جگہ ایسی اصوات سے کام لیتا ہے جن میں اظہاریت ہوتی ہے۔ بچوں کا برجستہ جذباتی ردِ عمل اشارات اور پھر اصوات کے ذریعے ہی رونما ہوتا ہے، اس لئے اظہار کا برجستہ انداز، دلالت کرنے والے اشارات و اصوات ہی کو زبان کا پیش خیمہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اس نظرئیے کے علمبرداروں نے دلالت کرنے والی آوازوں اور بول چال کے اجزا کی ظاہری مماثلت پر کافی زور دیا ہے۔ لیکن یہ مماثلت بالکل سطحی ہوتی ہے۔ **ڈیکارٹے** ''لسانیات'' کے فروغ پانے سے بہت پہلے ۱۶۲۷ء ہی میں دلالت کرنے والی آوازوں اور بول چال کے اجزا یا کلمات میں امتیاز کرنے کی تنبیہہ کر چکا تھا۔ **جے۔جی۔ہرڈر** نے ۱۷۷۲ء میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ''مجھے حیرت ہے کہ بعض فلسفی جذباتی آوازوں اور چیخوں کو زبان کا نقطۂ آغاز سمجھتے ہیں۔ سبھی جانور اپنے جذبات کا اظہار آوازوں ہی کے ذریعے کرتے ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ جانور بھی ابتدائی نطقِ انسانی سے ملتی جلتی ابلاغی صورت بھی پیدا نہ کرسکا۔ یہ آوازیں کتنی ہی لطیف، منظم اور مربوط کیوں نہ

ہوں' اگر انہیں بامقصد طور پر استعمال کرنے کا شعور نہ ہو تو وہ ابتدائی اور بھدی قسم کی انسانی زبان بھی نہیں بن سکتیں بچے بھی جانوروں کی طرح جذباتی آوازیں نکالتے ہیں لیکن کیا وہ جو زبان بعد میں سیکھتے ہیں' وہ ان آوازوں سے یکسر مختلف نہیں ہوتیں ؟

اگر ان فلسفیوں کے محاکمے پر غور کیا جاتا اور یہ سمجھ لیا جاتا کہ یہ مسئلہ بنیادی طور پر بشریاتی ہے اور اس کا حل حیاتیاتی تجربوں میں نہیں بلکہ نفسیاتی تجزئیے میں مضمر ہے تو اس نظرئیے کی تائید اور تردید میں وقت ضائع نہ کیا جاتا۔ اس میں شک نہیں کہ دلالت کرنے والی آوازیں اور چیخیں بھی اعضائے نطق ہی کا کرشمہ ہیں اور ان میں اور بول چال میں اعضائے نطق کی کارفرمائی اور سماعت قدر مشترک ہوتی ہے لیکن چیخیں ہوں یا بول چال' ان کی خاصیتیں تو ارادے ہی سے ماخوذ ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ بول چال کے محرکات مقصد اور ارادہ ہوتے ہیں' ابلاغ کی نیت سے بات چیت کی جاتی ہے۔ چیخوں اور دلالت کرنے والی آوازوں میں اظہاریت تو ہوتی ہے لیکن ابلاغی قدر نہیں ہوتی' ان کی بنیاد جذبات کی گھٹن سے چھٹکارا پانے کے رحجان پر ہوتی ہے' یہی حال برجستہ اشارات و حرکات کا ہے۔ ان سب کی کوئی سماجی غایت نہیں ہوتی۔ بول چال ابلاغ کی وجہ سے سماجی حیثیت رکھتی ہے۔ اول الذکر محض انفرادی عمل ہے اور موخرالذکر انفرادی بھی اور سماجی بھی۔ یہی نہیں بلکہ موخرالذکر میں تجربی مواد کی کثرت یا وحدت ہوتی ہے اور زبان تجربی مواد کو دوہری حیثیت سے پیش کرتی ہے قائل کا موضوعی تجربہ اس مواد میں تھوڑی بہت رنگ آمیزی' تھوڑا بہت اضافہ ضرور کرتا ہے' یہ اضافہ

مادی نہ سہی، تصوراتی و ذہنی ہی سہی، جس سے متعلق ابلاغ مقصود ہے۔ جذبات کا سیدھا سادا صوتی اظہار یا اشارہ مدلول میں کسی قسم کا کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ اگر دوسروں سے رابطہ پیدا کرنے کے ارادے سے اس اشارے کا تلازمہ ہوجائے تو پھر وہ دلالت کرنے والی حرکت نہ رہے گا بلکہ لسانی علامت بن جائے گا۔ دلالت کرنے والے اشارات و اصوات ذریعۂ ابلاغ نہیں بنتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان میں سے بعض بول چال کی آوازوں کے زیر اثر کچھ ترمیم کے بعد زبان میں دخیل ہوگئے ہیں۔ انسانی زبان کے بہت کم کلمات دلالت کرنے والی آوازوں سے ماخوذ ہوئے ہیں، بچوں کے غوں غاں کے زمانے کی فجائیہ آوازیں، ان کی بعد کی سیکھی ہوئی زبان میں باقی نہیں رہتیں۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ دلالت کرنے والی آوازوں نے زبان کے آغاز کے سلسلے میں کوئی تعمیری کردار ادا نہیں کیا ہے بلکہ لسانیاتی عمل نے بعد میں دلالت کرنے والی بعض آوازوں کو ابلاغ کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ ابتدائی فجائیہ آوازیں صوتی خصائص کے اعتبار سے کلمے سے بالکل مختلف ہوتی ہیں، ان کا تجزیہ ایسے عناصر میں نہیں کیا جا سکتا جو ایک صوتی کڑی میں باہم منسلک ہوسکیں، اسی لئے وہ غیر تغیر پذیر ہوتی ہیں، یہ خاصیت تغیر پذیر زبان کے بالکل بر عکس ہے، ایسی فجائیہ آوازیں محض جذبات کی مظہر ہوتی ہیں۔ ہاں حکائی فجائیہ (Onomato poetic interjections) کی حیثیت بالکل مختلف ہے، ان کا تعلق خارجی عوامل سے ہوتا ہے، لیکن ان کا زمانۂ تشکیل بہت بعد کا ہے، ان کی ساخت کسی نہ کسی موجود زبان کی رکنی ترکیب کے قیاس پر ہوتی ہے۔ ان میں زبان کی صوتی قدامت کا اثر تو ہوسکتا ہے لیکن وہ زبان کی پیش رو نہیں

ہو سکتیں۔

Revesz نے حیوانی آوازوں کی نقالی کے نظرئیے پر تنقید کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ جس قسم کی آوازیں جانور نکالتے رہتے ہیں، کم و بیش اسی قسم کی آوازیں انسان کو بھی ودیعت کی گئی تھیں، ان آوازں سے کام لینے کے لئے خارجی نمونوں کی کیا ضرورت تھی انسان ازخود یہ فطری آوازیں نکال سکتا تھا، ہاں اگر انسانی ماحول میں رہنے والے جانوروں میں سے کسی کی آواز میں ابلاغی قدر ہوتی تو انسان اسے ابلاغ کی غرض سے اختیار کرلیتا۔ بندروں اور بعض پرندوں کی مخصوص آوازیں دشمن کی آمد یا خطرے سے خبردار ضرور کرتی ہیں لیکن ایسے ترکیبی صوتی عناصر نہیں ہوتے جو زبان کے صوتیوں سے ملتے جلتے ہوں اور ان میں انسانی بول چال کی بنیادی خصوصیات کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ اظہار اور مدلول میں کسی قسم کا رابطہ نہیں ہوتا۔ ایک ہی آواز بہت سی باتوں یا ضرورتوں پر دلالت کرسکتی ہے یا بہت سی مختلف آوازیں ایک ہی ضرورت پردلالت کرسکتی ہے۔ ارتقائی نفسیات کے نقطۂ نظر سے یہ بات نمایاں ہے کہ حیوانی آوازیں یا نام نہاد حیوانی زبانیں طویل اور تدریجی ارتقا کا نتیجہ نہیں ہیں، ان کی کوئی تاریخ نہیں ایک جانور کی پوری زندگی کے دوران اس کی نام نہاد زبان میں کوئی تغیر کوئی اضافہ یا کوئی ارتقا نہیں ہوتا۔ تمام دنیا میں ایک نوع کے تمام جانوروں کی آوازیں، کم و بیش یکساں ہوتی ہیں، زمان و مکان کا بھی کوئی اثر ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

Revesz نے بشریاتی نظریات کے ذیل میں فطرت کی آوازوں کی نقالی کے نظرئیے، بچوں کی غوں غاں، بچگانی زبان، غنائی آوازوں یا گیتوں کے تقدم کے نظرئیے، نفسیاتی رحجان کے نظرئیے، اشارتی نظرئیے،

نظرئیے ' زبان کے انسانی عناصر اور خامیوں کے نظرئیے سے بحث کی
ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ نقالی کے نظرئیے پر بھی وہی
اعتراضات کئے جا سکتے ہیں جو سطورِ بالا میں دلالت کرنے والی
یا جانوروں کی آوزوں کے نظرئیے پر کئے گئے ہیں ۔ جانوروں کی
آوازوں کی تقلید کا نظریہ بھی نقالی کا نظریہ ہے ۔ نقالی فطرت کی
آوازوں کی ہو یا جانوروں کی آوازوں کی ' نقالی ہی کہلائے گی ۔
اس نظرئیے کی رو سے زبان کا آغاز محض ایک اتفاق ہے ۔ قدیم
انسان نے اپنے میں ودیعت کردہ صوتی مواد یا صوتی ملکہ سے
کام لے کر از خود زبان پیدا نہیں کی بلکہ فطرت کی آوازوں پر غور
کیا اور ان سے ابتدائی کلمات وضع کئے ۔ غالباً **لینبیز** نے پہلی بار
مختلف زبانوں کے مشترک مادوں کی یہ توجیہ کی تھی کہ ان سب
کا نقطۂ آغاز فطری آوازوں کی نقالی ہے ۔ **اسٹیول ہِل** کے نزدیک بھی
مخصوص فطری آواز اور مخصوص حسیاتی تاثر کے اضطراری اجتماع
سے قدیم انسان کو ابتدائی کلمے نصیب ہوئے ۔ **مرٹی** (Marty) نے
اس پر نکتہ چینی کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ہر ادراک
یا مشاہدے کے لئے فطرت کی آواز ڈھونڈ نکالنا ممکن نہیں ۔ انسان
کی تقلیدی آوازیں یا صوتی نقالی جبلی اورفطری اظہار کا نہیں بلکہ
سوچ بچار کا نتیجہ ہیں اور رواجی ہیں ۔ اگر یہ تسلیم بھی کرلیاجائے
کہ فطری آوازیں زبان کے ما قبل دور کی نمائندگی کرتی ہیں تو
یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مفروضہ جبلی نقالی مخصوص معانی سے
کیوں کر متصف ہوئی ۔ نقالی کی جبلت سے انکار ممکن نہیں لیکن
یہ جبلت تو سنی ہوئی فطری آواز کی باز آفرینی تک محدود ہوتی
ہے ۔ اور صوتی نقل کا صوتی سانچہ کم و بیش وہی ہوتا ہے جو
اصل فطری آواز کا ہے ' وہ زیادہ سے زیادہ ایک وقوعہ ' کو صوتی
سانچے میں ڈھالتی ہے ۔ اگر نقالی کو محض بازآفرینی تک محدود نہ

رکھا جائے بلکہ اس کے دائرے میں کسی شے کی نمائندگی اور ترجمانی بھی آجائے اور صوتی سانچوں کی مماثلت سیاق و سباق کو فوری طور پر قابلِ فہم بھی بنادے تو پھر نقالی، علامتی حیثیت اختیار کرلے گی۔ فطری آوازوں کی نقالی کو اس مفہوم میں استعمال کیا جائے تو اس کی اہمیت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اور یہ کہنا درست ہوگا کہ ایسی نقالی نے نطقِ انسانی کے لئے راہیں ہموار کیں اور زبان کے ابتدائی مرحلے میں بھی اچھا خاصا کردار ادا کیا۔

بچے بولنا شروع کرنے سے پہلے غوں غاں کرتے ہیں۔ ان کی غوں غاں اور ہکار بنیادی طور پر نفسیاتی خصوصیات کی مظہر ہوتی ہے، اور یہی ابتدائی بچگانہ کلمات ,,بابا،، ,,ماما،، ,,دادا،، وغیرہ کے صوتی سانچوں میں رونما ہوتی ہیں لیکن یہ صوتی سانچے محض جذباتی حیثیت رکھتے ہیں، ابلاغ مقصود نہیں ہوتا۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی غوں غاں بھی علامت کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ لیکن قدیم انسان کی ابتدائی منطوقات کی بچوں کی غوں غاں سے مثال نہیں دی جا سکتی کیوں کہ قدیم‌ترین بے زبان انسان کی زبان سے محرومی کے اسباب ننھے بچوں کی بے زبانی کی وجوہات سے بالکل مختلف ہیں، نو مولود بچہ، طبعی و جسمانی اور ذہنی اعتبار سے نا پختہ اور غیر مکمل ہوتا ہے اس لئے نہیں بول سکتا۔ لیکن قدیم ترین مفروضہ بے زبان انسان جسمانی اور ذہنی لحاظ سے ,,نا مکمل،، نہیں تھا، اس لئے لسانی اکتساب کے ضمن میں ان کا تقابل درست نہیں ہوسکتا۔ اس سوال کا جواب مشکل ہے کہ جب قدیم انسان ذہنی تکمیل کے مدارج طے کرچکا تھا، اور زبان کا طبعی میلان بھی رکھتا تھا تو وہ بول چال سے محروم کیوں تھا؟ ونٹ (Wundt) نے یہ صحیح کہا ہے کہ اس ذہنی حالت کا تصور ممکن نہیں

جو اتنی بالغ ہو کہ زبان تخلیق کرسکے اور پھر بھی تخلیق نہ کرے۔

لسانی ارتقا کے بالکل ابتدائی دور کا بچگانی زبان سے تقابل بھی صحیح نہیں۔ بچوں کا ابتدائی لسانیاتی عمل اصوات یا حرکات سے ظاہر نہیں ہوتا بلکہ تفہیم زبان میں نمو پاتا ہے۔ بچہ کلمات اور مسمی اور عمل یا وقوعے کے ربط کو سمجھنے کی کوشش پہلے کرتا ہے اور اپنے ماحول کی زبان کے صوتی و معنوی اثرات بتدریج قبول کرتا رہتا ہے۔ بالکل ابتدائی قسم کی تفہیم کے بعد ہی وہ بولنے کا تجربہ کرتا ہے اور آہستہ آہستہ سنے ہوئے کلمات کے تتلا تتلا کر دہرانے کی مشق کے بعد باقدہ بولنے لگتا ہے۔ قدیم ترین انسان کو اس قسم کے سماعی و نطقی مشق و تجربے کے موقعے کہاں ملے ہوں گے' اس لئے کہ بے زبان انسان کے سیکھنے کے لئے کوئی بنی بنائی زبان یا اس کے مختلف اجزا کے نمونے ہی نہیں تھے۔ ہاں یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح بچہ اپنے ذہنی نشو ونما کے ساتھ ساتھ زبان کے مختلف اجزا کو ترکیب دینا سیکھتا جاتا ہے اور نطقی تجربوں کے بعد اپنے ماحول کی زبان' ساخت، گرامر' معنے وغیرہ کے لحاظ سے صحیح بولنے لگتا ہے اسی طرح انسانی زبان کا ارتقا ہوا، یہ ارتقا صوتیات' معنویات' سرمائے اور نحو سبھی شعبوں میں ہوا۔ لیکن اس کے باوجود بچگانی زبان میں قدیم ترین ابتدائی انسانی زبان کے اجزا کے ترکیبی ڈھونڈنے کی کوشش عبث ہے۔

نطق انسانی پر گیتوں یا غنائی آوازوں کے تقدم کا تصور یونانی فلسفے میں ملتا ہے۔ **ڈارون** نے پہلی بار سائنسی افکار میں اس تصور کو جگہ دی اور انسان کی غنائی آوازوں کو زبان کا نقطہ' آغاز قرار دیا۔ **ہربرٹ اسپنسر** نے نظریہ' موسیقی میں یہی خیال پیش کیا ہے۔

ماہرینِ لسانیات میں یسپرسن نے شدومد کے ساتھ اس نظریے کی وکالت کی ہے۔ اس نظریئے پر بھی کم و بیش وہی اعتراض کیا جا سکتا ہے جو سطورِ بالا میں دوسرے چند نظریات پر ہو چکا ہے۔ غنائی آوازیں اور گیت وفورِ جذبات سے چھٹکارا پانے کی کوشش کا کرشمہ رہے ہیں جبکہ زبان کا مقصد بین الافرادی رابطہ اور افہام و تفہیم ہے۔ ان دونوں کے اظہار کی ہیئت اور مواد ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، ان کے ارتقا کے اصول بھی الگ الگ ہیں۔ بہت سی قدیم زبانیں غنائی خصوصیات سے محروم نظر آتی ہیں اور بعض ترقی یافتہ زبانوں میں خاصی غنائیت ملتی ہے۔

آغازِ زبان کا سراغ لگانے کے لئے یہ تحقیق بھی کی جاتی رہی ہے کہ کس انسانی رجحان اور نفسیات نے زبان کو جنم دیا، اس رجحان نے زبان کے آغاز و ارتقا کی کس طرح متاثر کیا۔ اس سلسلے میں دلالت کرنے والے حرکات و اشارات اور فجائیہ آوازوں کو زبان کا بھدا آغاز قرار دیا گیا اور یہ بھی کیا جاتا رہا کہ جس گھڑی متوجہ کرنے متنبہ کرنے یا ڈرانے والی کسی مخصوص پکار نے ایسی ہیئت اختیار کی جو ذہنی کیفیت کی بھی مظہر ہوئی اور پکار کی محرک شے یا عمل کی بھی، اسی گھڑی زبان، خیال کے ابلاغ کے ذریعہ کی حیثیت سے وجود میں آگئی۔ اور انسانی آواز کچھ چیزوں عمل کی عمومی علامت کے طور پر استعمال ہونے لگی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جذباتی پکار کو کلمہ بنا دینے والی گھڑی کب آئی ہوگی؟ عمومی علامت کی تشکیل کے لئے تجرید کی صلاحیت لازمی ہے اور یہ صلاحیت بول چال یا زبان کے بغیر بروئے کار بھی نہیں آتی۔ اس نظرئیے میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ اس میں آغازِ زبان کے مسئلے کی حیثیت محض ضمنی رہ جاتی ہے اور آغازِ خیال یا آغازِ فکر کا مسئلہ مقدم ہوجاتا ہے۔

آغازِ زبان کے نظریوں میں زبان کی حرکاتی و اشاراتی اور صوتی ہیئتوں کے تاریخی تقدم کے مسئلے کو بھی خاصی اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ یہ مسئلہ آغازِ زبان سے نہیں بلکہ زبان کی ابتدائی ہیئت سے تعلق رکھتا ہے۔ **ونٹ** اور بعض دوسرے محققین کی یہ رائے ہے کہ زبان کی اولین منزل حرکاتی و اشاراتی زبان کی منزل ہے، جس سے صوتی زبان نے ارتقا پایا۔ ان کا خیال ہے کہ اندرونی کیفیات اور خارجی اشیا اور اعمال کی نشان دہی حرکی اشارات کے ایک نظام کے ذریعے کی جاتی رہی ہے انسانی ارتقا کے ساتھ ساتھ حرکی اشارات کی نشان دہی نے صوتی اشارات کا روپ دھار لیا۔ اس طرح فطری اور رسمی و رواجی حرکات و اشارات نے صوتی علامتوں کے لئے راستہ ہموار کردیا۔ گویا باطنی اور خارجی محرکات کے جوابی افعال کا ذریعہ حرکی ردِ عمل ہوتا تھا اور ان جوابی افعال کا اظہار حرکی اشارات کے وسیلے سے ہوا کرتا تھا۔ اس طرح فطری حرکات و اشارات کا ایک باقاعدہ نظام وجود میں آگیا۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ جن جانوروں کو آواز پیدا کرنے والے اعضا ودیعت کئے گئے ہیں وہ جذباتی اظہار کے لئے مختلف حرکات و اشارات سے بھی کام لیتے ہیں اور آوازوں سے بھی۔ ان میں سے کسی ایک ذریعے کو مقدم اور دوسرے کو موخر ثابت کرنا ممکن نہیں۔ بہت سے پرندے اور بندر زیادہ تر اپنی آوازوں ہی کو کام میں لاتے ہیں۔ انسان بھی شروع ہی اعضائے نطق سے متصف ہے۔ وہ باطنی یا خارجی محرکات کے جوابی ردِ عمل کا اظہار حرکات و اشارات کے ذریعے بھی کرسکتا تھا اور صوتی اشاروں اور نطق کے ذریعے بھی۔ اس لئے اس بات پر اصرار کہ انسان کی حرکاتی و اشاراتی زبان کو نطق پر تقدم حاصل ہے،

درست نہیں۔ حرکاتی و اشاراتی زبان اور صوتی زبان میں مظاہراتی اعتبار سے بعد المشرقین ہے۔ اُن کا اشارتی مواد، اجزائے ترکیبی، اظہار کے اسلوب، ساخت کے اصول ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ اسی لئے تشریحی لسانیات کا کوئی ماہر اصوات کی بحث کا ڈانڈا حرکات و اشارات سے نہیں ملاتا، اشتقاقیات کا کوئی طالب علم کسی کلمے کی اصل کا کھوج لگاتے ہوئے حرکات‌واشارات کے سر چشمے پر نہیں پہنچتا۔

آغازِ زبان کے فلسفیانہ نظریوں کو بڑی مقبولیت حاصل رہی ہے۔ ان نظریوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) خلقیت پسندانہ اور (۲) تجربیت پسندانہ۔ اول الذکر کی رو سے انسان کی، نطقی استعداد ودیعت کردہ ہے اور اس استعداد کی وجہ سے وہ خودبخود بولنا شروع کردیتا ہے۔ موخر الذکر کی رو سے زبان کے آغاز کے سلسلے میں تجربے، قوتِ ارادی، اورفکر خصوصاً قیاسِ تمثیلی کو فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے۔ پہلے گروہ کے نظریات کے علم برداروں میں **ہمبولٹ، اسٹین تھل، میکس ملر، رینان، ونٹ** وغیرہ ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور دوسرے کے مبلغوں میں **کونڈلِ اک، ہوبس، ڈارون، شلر، میڈوگ، مارٹی** پیش پیش نظر آتے ہیں۔

اول الذکر گروہ کے ممتاز نظریات کے مطالعے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ان کے موئیدین نے آغازِ زبان پر تو توجہ مرکوز کی ہے لیکن ما بعد ارتقا کو بالکل نظرانداز کردیا ہے۔ اگر انہوں نے نموئے لسان، پر بھی توجہ دی ہوتی تو شاید انہیں یہ احساس بھی ہوتا کہ تجربی عناصر بھی درخورِ اعتنا ہیں۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ انسان کی ان گنت نسلوں نے زبان کی تشکیل میں شعوری طور پر تعاون کیا ہے۔

بچوں میں نموئے لسان کے سلسلے میں ان کی یہ رائے کہ زبان کے مخصوص عناصر بچوں کے تصرف میں ہوتے ہیں اور صرف اعضائے نطق کی نا پختگی کی وجہ سے وہ کلموں کی ادائیگی سے قاصر رہتے ہیں۔ صحیح نہیں۔ اس کے بر عکس تجربیت پسند بول چال کے ملکہ کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کرتے اور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کوئی بچہ بول چال کی باطنی استعداد کے بغیر بولنا نہیں سیکھ سکتا۔ بچے کی بول چال کے نمو پانے میں تجربے، ماحول کے لسانی اثرات، ذاتی پہل کاری یا ہدایت، انفرادی استعداد وغیرہ کی کارفرمائی سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر خلقیت پسندی اور تجربیت پسندی کے نظریات میں اعتدال اور امتزاج ہو تو ایک معقول نقطۂ نظر پیدا ہوسکتا ہے۔

خلقیت اور تجربیت کی بحث میں لسانی احساس کا مسئلہ بھی زیر غور آجاتا ہے۔ اور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا لسانی احساس باطنی ہوتا ہے یا اکتسابی۔ لیکن اس سوال کا معقول حل تلاش کرنے سے پہلے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ آخر لسانی احساس سے کیا مراد ہے؟ اگر اس سے مراد زبان سیکھنے کی فطری صلاحیت یا بول چال کا ملکہ ہے تو ظاہر ہے کہ وہ ایک باطنی چیز ہے۔ لیکن اگر کسی زبان یا لسانی گروہ کی وہ اندرونی ساخت مراد ہے جو کسی معاشرے کی لسانی عادتوں کا تعین کرتی ہے اور بولی جانے والی زبان کو اثر و نفوذ کی قوت بخشتی ہے، تو پھر وہ اکتساب اور تجربے ہی کا کرشمہ ہے۔ رے ویز نے لسانی احساس کے علاوہ ایک اور احساس کی نشاندہی کی ہے جسے وہ لسانیاتی ہیئت کے احساس سے موسوم کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ان دونوں میں لطیف سا فرق ہے۔ بول چال کی فطری استعداد، کلموں کی تفہیم، اور ان کے بلا تکلف استعمال

کے رجحان کو لسانی احساس سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور زبان کی مسلمہ رسمی و کلی حیثیت کو برتنے کا وہ حقیقی اقدام جو فرد کی افتادِ طبع کے مطابق ہوتا ہے، لسانیاتی ہیئت کا احساس کہلا سکتا ہے۔ لسانی احساس کا تعلق زبان کے عمومی خاکے ہی سے ہوتا ہے لیکن اسانیاتی ہیئت کا احساس کسی مخصوص زبان کی مابہ الامتیاز خصوصیات سے تعلق رکھتا ہے اور ہم اسے اپنی مادری زبان کے ذریعے سے پیدا کرتے ہیں۔ اسی ہیئت سے ہماری انفرادی بول چال نمو پاتی ہے۔ خود ساختہ پرائیویٹ زبان بچوں کے بعض گروہوں کی بنائی ہوئی خصوصی زبان، قدیم لوگوں کی خفیہ زبان مروجہ زبانوں سے کتنی ہی مختلف سہی، مادری زبان کی کلماتی و فقراتی تشکیل کے انداز کی آئینہ دار ضرور ہوتی ہیں۔

خلقیت اور تجربیت کی بحث میں ایک اور مسئلے سے دوچار ہونا پڑتا ہے جس کا تعلق ارتقائے لسان کے رضاکارانہ تصور سے ہے۔ اس تصور کے مقابلے پر جبریت کا تصور بھی نظر آتا ہے، جس کی رو سے ارتقائے لسان غیر ارادی ہوتا ہے۔ یہ دونوں نقطہ ہائے نظر بظاہر متضاد ہیں لیکن لسانیاتی نظریے میں انہیں ایک دوسرے سے مربوط بلکہ ایک دوسرے کا تکملہ سمجھا جا سکتا ہے۔ بیسویں صدی میں ان نقطہ ہائے نظر کے پر جوش مبلغ **ونٹ** اور **مارٹی** نظر آتے ہیں۔ **ونٹ** کا خیال ہے کہ زبان اپنی ماہیت کے اعتبار سے جذباتی اظہار کے سوا کچھ اور نہیں۔ وہ اپنے ارتقا کے ہر دور میں انسانی قصد و ارادہ سے آزاد رہی ہے۔ اور دلالت کرنے والے حرکات اور اشارات کی ایک مخصوص ہیئت ہی جو انسانی شعور کے ارتقا کی اولین منزل سے خصوصی ربط رکھتی ہے۔ **ونٹ** آغازِ زبان کی اس رضاکارانہ حیثیت کی برزور تردید کرتا ہے جس کی رو سے

زبان کی تشکیل میں ابلاغ کے ارادے کی کارفرمائی ناگزیر سمجھی جاتی ہے۔ لیکن وہ دبی زبان سے استثنائی ارادی تشکیل کا بھی قائل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انسان ابلاغ کا آرزو مند رہا ہے اور ابلاغ کے لئے نت نئے کلمے اور اظہار کی صورتیں تلاش کرتا رہا ہے۔ اس طرح زبان کی تشکیل ارادی ہی رہی ہے لیکن زبان کے بعض عناصر فطرت کی مختلف قوتوں کے مرہون منت رہے ہیں ان عناصر کی تشکیل میں انسانی قصد و ارادہ کو دخل نہیں۔ ہنبولٹ، ونٹ سے اصولی اتفاق تو کرتا ہے لیکن زبان کو انسانی تجربے کی گہرائی سے ماخوذ بھی بتاتا ہے اور اسے ایک مخصوص مقصد کے حصول کی ذہنی کاوش کا نتیجہ بھی سمجھتا ہے۔

زبان کی میکانیت اور اس کے لئے انسان کا طبعی رجحان بنیادی طور پر حیاتیاتی سہی، زبان کے آغاز اور ارتقا کوالتزاماً حیاتیاتی عمل نہیں کہہ سکتے۔ زندہ زبان کے لئے قوت ارادی کی تحریک اور ذہنی عمل ضروری ہے اور یہ قصد اور شعوری پہل کاری کے بغیر ممکن نہیں۔ مارٹی نے اسی نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔ اس نے اپنی ابتدائی تحریروں میں انتہا پسندی کا ثبوت دیا ہے اور یہاں تک کہہ دیا ہے کہ زبان کی تشکیل کا ہر انفرای اقدام شعوری ہوتا ہے۔ ونٹ نے اس کے اس نقطۂ نظر کو اختراعی نظریہ قرار دیا تو اس نے یہ رائے ظاہر کی کہ اس کے نزدیک زبان، ابلاغ کی ایسی ہیئت نہیں ہے جس کی کسی سابقہ مفاہمت کے مطابق منصوبہ بندی کی گئی ہو۔ زبان کے تمام کلموں اور ہیئتوں کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی نہ کسی وقت انہیں ایک یا زیادہ افراد نے ابلاغ کی غرض سے تجرباتی طور پر تشکیل دیا اور شعوری طور پر ان کے خالق ہوئے

لیکن انھیں ان کلموں اور ہیئتوں کے مستقبل کا یا زبان کے عناصر بن جانے کا اور زبان کی ارادی تشکیل کا گمان بھی نہ ہوگا۔ ابلاغ کی اس طرح کی کوشش شعوری اور ارادی تھی یہ تجرباتی کوشش معاشرے کے دوسرے افراد کی قبولیت کی محتاج تھی اس لئے اس کے لئے انتخاب و اختیار کا مسئلہ بھی در پیش ہوا۔ انتخاب واختیار کا یہ عمل کلموں کے خالق تک محدود نہ رہا بلکہ معاشرے کے دوسرے افراد پر بھی اس کا انحصار ہوا۔ ان میں سے کچھ دوسروں کی زبانی پر بار نہ پاسکے اور کچھ قبولِ عام کی سند پا کر زبان کے مستقل اجزا بن گئے اور ان کی اصوات' نے صوتی عادتیں متعین کیں۔ جس فرد نے بھی زبان کی تشکیل میں اس طرح حصہ لیا' اس نے تو صرف ہنگامی ضرورت کے تحت وقتی تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ ایسے افراد میں سے کسی کو زبان کی مجموعی حیثیت اور ہیئت میں کسی قسم کے ٹھوس اضافے اور کسی مخصوص لسانی نتیجے کا کوئی شعور نہ ہوگا۔ جس انداز سے یہ کلمے اور ہیئتیں وضع ہوئی ہوں گی' ان کا لسانیاتی شعور بھی کسی کو نہ ہوگا۔ اس لحاظ سے زبان کی تشکیل کو غیر شعوری یا غیر ارادی قرار دیا جا سکتا ہے۔

ان مباحث سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رضاکاریت اور جبریت کے علم برداروں نے بہ جائے آغاز زبان کے تشکیل زبان پر تمام تر توجہ مرکوز کی ہے۔

رضاکاریت کی ایک انتہائی صورت اختراعی نظریے میں جھلکتی ہے۔ اختراعی نظریے کی رو سے زبان کی ابتدائی تشکیل اور ارتقا کے سلسلے میں تخلیقی جذبے اور ابداعی ذہنی جوہر کو تخلیقی عناصر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس نظریے کی ابتدائی خدوخال

مشہور فلسفی ڈائیڈمین کے یہاں ملتے ہیں۔ ڈائیڈمین نے آغازِ زبان کے ضمن میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ انسان نے اتفاق سے اشاراتی زبان اختیار کی لیکن اسے اس کی بے بضاعتی کا جلد اندازہ ہوگیا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے جذبات اصوات کے متقاضی ہیں، یہ بھی مشاہدہ کیا کہ جانور آواز کے استعمال سے کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ارتباط کی خواہش نے اسے ابلاغ کے ذریعے کی ضرورت بھی محسوس کرائی۔ چناں چہ اس نے اپنے اعضائے اصوات کو کام میں لانے کی کوشش کی۔ اس طرح انسان کی ابتدائی منطوقات وجود میں آئیں۔ گویا زبان انسان کی ایک اختراعی کوشش ہے۔ ,, انفرادیت ،، کے جو نظریے بعد میں انیسویں صدی میں فروغ پاتے رہے، ان سب میں ڈائیڈمین کے خیالات کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ اختراعی نظریے کی ایک صورت شلیگل کے فلسفۂ زبان میں بھی نظر آتی ہے۔ شلیگل کے نزدیک زبان تدریجی ارتقا کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ ایسی چیز ہے جو ایک بھرپور اندرونی زندگی اور جیتے جاگتے شعور سے براہِ راست بنی بنائی اچانک وجود میں آگئی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ زبان ابتدا ہی سے لسانیاتی اعتبار سے اتنی ہی ترقی یافتہ ہے جتنی اب نظر آتی ہے بلکہ وہ صرف یہ جتانا چاہتا ہے کہ انسان کی ابتدائی زبان بھی زبان کے لازمی عناصر سے متصف تھی۔ علامتی ماہیئت کی مفردہ صوتی تشکیلات کے ذریعے ابلاغ کا ارادہ انسان کے شعور میں جڑ پکڑ چکا تھا۔ یسپرسن کو تاریخ لسانیات میں خاصی اہم حیثیت حاصل ہے۔ اس کے یہاں بھی ڈائیڈمین کے ڈیڑھ سو سال بعد، اختراعی نظریے کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔

ان نظریاتی نظاموں سے ہٹ کر بعض ایسے لسانیاتی نظریے

بھی ہیں جنہیں محولہ بالا نقطہ ہائے نظر کے ماتحت شمار نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں دو ایسے ممتاز ماہرین لسانیات کے نقطہ ہائے نظر کو مثالاً پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جنہوں نے فلسفۂ لسان کی جولاں گاہ میں کچھ فکر انگیز گوشوں کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے نام ہیں **ولیم فان ہمبولٹ** اور **ارنسٹ رینان**۔ دونوں کی یہ رائے ہے کہ ابتدا ہی سے زبان کے تمام وظائف و اعمال سرگرم رہے ہیں اور قدیم ترین انسان کو لسانی ہئیتوں کے تنوع پر دسترس حاصل تھی۔ **ہمبولٹ** تو یہ بھی کہتا ہے کہ ''زبان اپنے آغاز میں بھی مکمل طور پر ''بشری'' ہے اور تمام مدرکات و افکار پر قصداً و عمداً حاوی ہو جاتی ہے۔ کوہساروں اور صحراؤں تک کے خانہ بدوش قبائل میں کوئی قبیلہ ایسا نہیں ہوا جو لوک گیتوں سے محروم رہا ہو، اور لوک گیت معتدبہ الفاظ اور قواعدی ہئیتوں پر مشتمل رہے ہیں'' اس کے نزدیک زبان ایک فطری عطیہ ہے اور ذہن کی قوت کی عمل پذیری کا ایک ذریعہ۔ ایسا ذریعہ جس کی اساس اس اصول پر ہوتی ہے جو اندرونی طور پر زبان کی تنظیم کرتا ہے اور جسے لسانیاتی احساس قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ لسانیاتی احساس فرد کے باطن میں موجود رہتا ہے اور یہی زبان کی اول ترین خیالی تصویر ہے۔ **ہمبولٹ** کے فلسفۂ لسان کی بنیاد مابعدالطبیاتی ہے، اس لئے اس میں آغاز زبان کے مباحث نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ کم و بیش یہی نقطۂ نظر **ہمبولٹ** کے مقلد ایچ **اسٹین ہل** نے بھی پیش کیا ہے، اس نے لسانی تحقیق کو نفسیاتی آب و رنگ زیادہ دیا ہے۔ **اسٹین ہل** نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ زبان منطق یا گرامر سے آزاد ہوتی ہے، اس نقطۂ نظر کو **بینی دیتو گروس** نے اب

سے پچیس تیس سال پہلے فروغ دیا ہے۔ لیکن **گروس اسٹین ہل** کی طرح زبان کو ذہن کی اختراع قرار دے کر آغاز زبان کے تصور کو اس کے صحیح مافیہ سے محروم کر دیتا ہے۔

رینان آغاز زبان کے مسائل سے بحث نہیں کرتا بلکہ زبان کی ابتدائی ہئیتوں کے ارتقا ھی پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ اس کے نزدیک زبان اپنے وجود کے پہلے ہی دن سے ابلاغ کا وسیلہ ہے اور اپنی بنیادی ساخت کے اعتبار سے مکمل ہے۔ اس طرح وہ ماقبل تاریخ لسانی مباحث کو نظر انداز کر دیتا ہے اس نے اصوات کی نقالی کی جو بحث پیش کی ہے اسے آغاز زبان کے مسائل سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کی رائے میں فطری اصوات کی نقالی ماقبل لسان، صوتی اظہار نہیں بلکہ یہ اصوات انسان کے ابتدائی لفظی مواد کے ماخذ ہیں۔

گہلن (*Gehlen*) کے فلسفیانہ اور بشریاتی نظریۂ لسان میں بھی آغاز زبان کے مسائل سے بحث نہیں ملتی۔ وہ ان لسانی مادوں کی تخصیص کرتا ہے جن سے زبان کی ماہئیت اور خصوصی مزاج کی توجیہ ہو سکے۔ اس ضمن میں وہ بات چیت کے حرکی پہلو (***Motor aspect***) پر زیادہ زور دیتا ہے۔

فرٹز ماتھنر (***Fritz Mathner***) نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ گفتگو بجائے خود ویسا ہی حیاتیاتی عمل ہے جیسا کہ سانس لینا یا چلنا۔ اسی لئے اس کی وضاحت اور توجیہ کی ضرورت ہی نہیں۔ زبان کے لئے اعضائے نطق کی موجودگی کافی ہے۔ ان اعضا سے زبان خود بخود جنم لیتی ہے۔ اگر ہم لسانی تاریخ کے نقوش پر الٹے قدموں چلیں تو کبھی ایسی منزل پر نہ پہنچ سکیں گے جہاں مکمل

اصوات نطق کے تصورکو ترک کرنا پڑے - " زبان کی اولین ہیئت کی
رسی بھی ایسی منزل پر نہیں پہنچا سکتی جہاں زبان کا وجود نہ ہو
مائتھنر در اصل انسان کی ایسی حالت کا تصور پیش کرتا ہے جب
انسان نطق سے کام تو نہیں لیتا تھا لیکن تشکیل زبان کی قدرت رکھتا
تھا - ایسی حالت کا اندازہ لسانی ارتقا کی تشکیل جدید سے ممکن
نہیں - اس نے لسانیاتی ابلاغ کی امکانی ما قبل تاریخ کا کوئی تصور
پیش نہیں کیا ہے -

آغاز زبان کے الٰہیاتی نظرئیے کی رو سے زبان عطیۂ الٰہی ہے -
اس لئے اس میں آغاز زبان کے مسائل کی علمی تحقیق کا سوال ھی پیدا
نہیں ھوتا -

جرمن ماہر لسانیات **رے ویز** (*G-Revesz*) کی رائے میں زبان
کا لازمی عنصر اس کا مقصد ہے - اس بات کی تفہیم کے لئے کہ
ابلاغ کے مختلف وسائل نے کس طرح زبان کے مقصد کو پورا کیا
اور وہ ارتقا کی کن منزلوں سے گذرے یا دوسرے لفظوں میں زبان کی
ماقبل تاریخ کی تشکیل جدید کے لئے ارتباط یا ابلاغ کی ان ہیئتوں سے
آغاز کرنا ضروری ہے جو ماقبل لسان دور میں اس مقصد کو پورا
کرتی رہیں اور جو اسی اصول کی مطیع رہی ہیں' جس کا سکہ زبان
پر بھی چلتا رہا ہے - اس نے ابلاغ کے مقصد کے لئے مستعمل تمام
وسائل اظہار کے آغاز' ارتقا' وظیفہ و عمل پر حاوی ہونے والا اصول
دریافت کرنے کی کوشش کی اور نظریۂ ارتباط پیش کیا - اس کے نزدیک
"ارتباط سے مراد عمرانی حیوانوں کا وہ بنیادی باطنی رجحان ہے جو
انہیں ایک دوسرے سے قریب آنے تعلقات استوار کرنے' تعاون
کرنے اور ابلاغ پر مجبور کرتا ہے - "ارتباط" سوشل گروپوں کے
تمام افراد کی زندگی کا آفاقی اصول ہے - نظریۂ ارتباط کی رو سے
ابلاغ کی مختلف صورتیں باھمی رابطے کی آوازوں کی مرہون منت

رہی ہیں اور ان کا دائرہ عمل وسیع تر اور زیادہ بامقصد ہوتا رہا ہے ۔ اس طرح ابلاغ کی صورتیں ارتقائی مدارج طے کرتی ہوئی اس منزل پر پہنچ گئیں جہاں زبان کی صورتیاتی اور تشکیلیاتی حیثیت اور عمرانی وظائف کے تعین نے ایک قیمتی تہذیبی سرمائے کوانسانی زندگی کا لازمہ بنا دیا ۔ اس نظرئیے میں حیاتیاتی اور بشریاتی نظریات کا امتزاج ہے ۔ چوں کہ یہ نظریہ فطری آوازوں سے زبان کو اخذ کرتا ہے اس لئے اسے حیاتیاتی نظریات کے زمرے میں بھی شمار کیا جا سکتا ہے ۔ انسان کی عمرانی حیثیت اور ذہنی رابطے کے ابلاغی التزام کی وجہ سے یہ نظریہ بشریاتی نظریات کے دائرے میں آ جاتا ہے ۔

بھوک، جنس اور تحفظ کی جبلتیں حیوانی ارتباط کی محرک ہوتی ہیں اور انہی کی وجہ سے اکثر حیوانوں میں ''گروہی جبلت'' پیدا ہو جاتی ہے ۔ یہی جبلتیں بعض جانوروں کو انسان کے ساتھ رہنا سکھا دیتی ہیں ۔ انسانی ارتباط کی محرکات بھی یہی ہیں ۔ لیکن انسان میں جذباتی ارتباط بھی ہوتا ہے اور جب جذباتی ارتباط کا مطمع احساس کی ترسیل ہو جائے تو ارتباط زیادہ گہرا ہو جاتا ہے ۔ ابتدائی ارتباطی آوازیں آہستہ آہستہ جذبات کی مظہر بنتی ہیں اور پھر یہی آوازیں معمولی چیخ کی سطح سے بلند ہوکر پکار یا بلاوے کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں ۔ ''بلاوا'' الفاظ کا روپ دھار لیتا ہے اور اس طرح زبان تشکیل پانے لگتی ہے ۔ نظریہ ارتباط اس طرح کے دلائل سے ابلاغ کی مختلف صورتوں اور لسانی ارتقا کی ایسی تفصیل فراہم کرتا ہے جس کی بنیاد جانوروں اور بچوں کی نفسیات کی تحقیق، نیز عام لسانیات اور تقابلی لسانیات کے استقرائی نتائج پر استوار ہے ۔ جدید ماہرین لسانیات کے نزدیک آغاز زبان کی سراغ رسی اسی طرح قرین قیاس بلکہ منطقی ہو سکتی ہے ۔

آغاز زبان کی بحث کے ساتھ ساتھ یہ سوالات بھی ابھرتے ہیں کہ

آیا قدیم تریں انسانی زبان ایک ہی تھی اور تھی تو وہ کیا ہو سکتی ہے، یا قدیم تریں انسان کی زبان کیا تھی - **جیکب بوھمے** نے قدیم ترین انسانی زبان کو ''لنگوا آدمیکا'' کے نام سے موسوم کیا ہے اس کے نزدیک اولین انسان نے ابلاغ کی غرض سے جس صوتی تسلسل کو استعمال کیا وہی لنگوا آدمیکا ہے - جس سے شاخ در شاخ زبانوں کے سلسلے پیدا ہوتے گئے - لیکن تاریخ یا تقابلی لسانیات سے اس نقطۂ نظر کے شواہد نہیں ملتے - ''اُم الالسنہ'' کا اس قسم کا تصور بہت سے مذہبی عالموں میں عام رہا ہے اور مختلف ادوار میں عبرانی، عربی، سنسکرت وغیرہ کو ام الالسنہ قرار دیا جاتا رہا ہے - کسی ایک زبان کو تمام انسانی زبانوں کا ماخذ اور سر چشمہ قرار دینے کا یہ رجحان لسانیات کے فروغ پانے سے پہلے ہی نظرآتا ہے - ایک ''اوریجنل زبان'' کے مقابلے پر بہت سی ''اوریجنل زبانوں'' کا تصور زیادہ قریں قیاس ہے -

---

صوتی ابلاغ

مختلف صورتیں اور اُن کا ارتقاء

جرمن ماہر لسانیات کے نزدیک منطوقاتی تسلسل کا ارتقا ھی انسانی زبان کی ترقی کا ضامن ہو سکتا ہے اس لئے زبان کے آغاز و ارتقا کے ضمن میں حرکاتی و اشاراتی زبان پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے نطق انسانی اور ابلاغ کی صوتی صورتوں کا جائزہ ہی مناسب ہو سکتا ہے - لیکن تاریخی شواھد کی عدم موجودگی میں یہ ممکن نہیں کہ ابلاغ کی مختلف صورتوں نے فی الواقع ارتقا کے جو مدارج طے کئے ہیں، ان کو تاریخی صداقتوں کی حیثیت سے متعین اور مربوط کیا جا سکے - تاہم ارتقا کے منطقی مفہوم کے پیش نظر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ابلاغ کی مختلف صورتیں کس طرح ظہور پذیر ہوئی ہوں گی -

دلالت کرنے والی آوازیں جذبات کی مظہر تو ہوتی ہیں لیکن عموماً یہ آوازیں اپنے ہم جنسوں کو متاثر کرنے کے لئے نہیں نکالی جاتیں، بلکہ ان کا غیر شعوری مقصد ہیجان سے چھٹکارا پانا یا دل کا غبار نکالنا ھی ہوتا ہے - ان کی تہ میں باھمی یا اجتماعی ارتباط کے رجحان کا شائبہ بھی نہیں ہوتا اس لئے ان میں کوئی ابلاغی قدر نہیں ہوتی - ھاں اگر یہی آوازیں فجائیہ آوازوں کی طرح، کسی شعوری مقصد سے نکالی جائیں تو اس میں ارتباط کا ارادہ بھی شامل ہو سکتا

ہے اور وہ ابلاغ کا ذریعہ بن سکتی ہیں اگر کوئی اظہاری آواز دوسرے ہم جنسوں میں کوئی مناسب رد عمل پیدا کرتی ہے تو اسے محض اتفاق کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس آواز کا محرک کوئی ابلاغی ارادہ نہ تھا ۔ ایسی صورت میں اظہاری آواز ابلاغ سے ملتی جلتی محسوس ہوتی ہے لیکن چونکہ یہ آواز ابلاغ کی غرض سے نہیں نکالی جاتی اور سننے والے کے لئے کوئی ایسا رمزی پہلو پیدا نہیں کرتی جسے تجربے سے سمجھا جا سکے، اس لئے اسے حقیقی معنوں میں ذریعۂ ابلاغ نہیں کہا جا سکتا ۔ کسی خوفزدہ جانور کی اچانک چیخ ' دوسرے جانوروں کو متوحش کر دیتی اور بھاگنے پر اکساتی ہے، کسی بھڑکے ہوئے پرندے کی پھرپھراہٹ، دوسرے پرندوں کو بوکھلا دیتی ہے ۔ بندروں کے غول کے غول بغیر کسی ابلاغی مقصد کے اپنی چیخوں سے آسمان کو سرپر اٹھا لیتے ہیں ۔ ان تمام اظہاری آوازوں میں ارتباط یا ابلاغ کے ارادے کا فقدان ہوتا ہے کیونکہ یہ جانور، دوسروں پر رد عمل کی آس پر یہ آوازیں نہیں نکالتے ۔ اسی طرح بے زبان بچہ بھی بہت سی ایسی آوازیں نکالتا ہے جن سے اس کی جذباتی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے ۔ فجائیہ آوازیں بھی بنیادی طور پر اظہاری آوازیں تھیں اور زبان میں دخیل ہونے کے بعد ھی ان کی ابلاغی حیثیت متعین ہوئی ہے ۔ خارجی شواھد کی بنیاد پر یہ فیصلہ ممکن نہیں کہ کسی جانور کی آواز اظہاری ہے یا ارتباطی ۔ لیکن کسی جانور کی جنسی خواھش کا صوتی یا حرکاتی اظہار جنس مخالف سے ارتباط کی غرض کے بغیر بھی نہیں ہو سکتا ۔ تاھم جب تک جانور کو یہ تجربہ نہیں ہو جاتا کہ اس کی جنسی خواھش کا اظہار کرنے والی مخصوص آواز کے نتیجے میں جنس مخالف سے قرب اور پھر ارتباط میسر آتا ہے، اس وقت تک وہ اپنی آواز کے ذریعے اپنے جنسی خلفشار ھی کا اظہار کرتا ہے لیکن اس تجربے کے بعد اس کی آواز ایک اشارہ یا سگنل کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور پھر اسی کی آواز ایک جنسی بلاوا

بن جاتی ہے ' جس میں ابلاغی قدر بھی ہوتی ہے - اس طرح اظہاری آواز ارتباطی آواز میں تبدیل ہو جاتی ہے - انسانی بچے کی اظہاری آواز بھی اسی طرح ارتباطی رد عمل میں ڈھلتی نظر آتی ھے - بچہ پیدائش کے بعد کچھ مدت تک' اسی وقت چیختا ہے جب اسے کسی قسم کی تکلیف ہوتی ہے یا کوئی جذباتی ردعمل ہوتا ہے - وہ اپنی کیفیت کا ''ابلاغ'' نہیں چاہتا اور نہ ھی کسی کی مدد طلب کرتا ہے - وہ تو ماحول سے خود کو ممتاز بھی نہیں کر پاتا - جب وہ اپنے آپ کو ماحول سے الگ محسوس کرنے لگتا ہے - اور اسے انفرادیت کا تھوڑا بہت احساس ہوتا ہے تو پھر وہ ماحول سے رابطے کی ضرورت بھی محسوس کرتا ہے - شروع شروع میں یہ تعلق ابلاغی نہیں بلکہ صرف ارتباطی ہوتا ہے - عام انسانوں میں صوتی ارتباط کے رد عمل کے باقاعدہ مشاہدے اور مطالعے کی کوشش تو ابھی تک نہیں کی گئی ہے تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ حیاتی ارتباط پرمبنی صوتی اظہار کو ابلاغ پر تقدم حاصل ہے - اس طرح کے صوتی اظہار کو محض اظہاری آواز نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس کا محرک ارادہ اور شعور ہوتا ہے' ہاں اسے افہام و تفہیم یا ابلاغ کے ذریعے کے مقابلے پر کم ترقی یافتہ سمجھا جا سکتا ہے - اسے ابلاغ کا پیش رو بھی قرار دیا جا سکتا ہے -

اکثر موقعوں پر انسان یا جانور اپنے ہم جنسوں کی مدد یا ان کے تعاون کا متلاشی ہوتا ہے اور اس غرض سے کوئی نہ کوئی مناسب ذریعۂ ابلاغ استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے - ایسی حالت میں صحیح معنوں میں ابلاغ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے - ارتباطی آواز ایک طرح کی پکار یا بلاوے کی شکل میں ڈھل جاتی ھے اور ایک اشارے یا سگنل کا منصب ادا کرتی ہے - ارتباطی آواز جبلی برجستہ اور جذبات کی تحریک کی مرہون منت ہوتی ہے' اس کا ابلاغی

مقصد نہیں ھوتا بلکہ وہ محض اظہار کا ایک ذریعہ ھوتی ہے لیکن ابلاغی بلاوا کسی نہ کسی فرد یا افراد تک کسی نہ کسی احساس، یا جذبے کے ابلاغ کی ضرورت پر مبنی ھوتا ہے اس کے ساتھ ایکطرح کی توقع بھی متلزم ھوتی ہے - اس کے بعد جانور کوئی نہ کوئی آس ضرور لگائے رکھتا ہے، کسی نہ کسی نتیجے کا منتظر رھتا ہے - اس کا تخاطبی انداز، ایک طرح کا تحکمانہ تیور اور توقع یہ سب مل کر اس میں سگنل کی سی خصوصیت پیدا کر دیتے ہیں - ابلاغی بلاوے کی دو صورتیں ھوتی ہیں (۱) غیر کلماتی چیخ اور (۲) براہ‌راست تخاطبی بلاوا - یہ دونوں ابلاغ کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ صورت یعنی کلمے سے نچلی سطح کے ابلاغی ذریعے ہیں - غیر کلماتی چیخ صوتی ابلاغ کی بالکل ابتدائی صورت ہے، جس کی مثالیں جانوروں اور بے زبان بچوں کی زندگی میں نمایاں ہیں - چیخ کا مقصد کسی خاص فرد سے ارتباط نہیں بلکہ وہ تو صرف ماحول یا خارجی دنیا کے کسی مناسب عمل کے ذریعے تعاون کی ترغیب کی ایک کوشش ھوتی ہے - یا یوں کہیئے کہ چیخنے والا اپنی چیخ کی پناہ میں خارجی دنیا سے اپنی حاجت روائی کی آس لگائے رکھتا ہے اور صورت حال کی ایسی تبدیلی کا منتظر رھتا ہے جو اس کو ہیجان یا قرب سے نجات دلا سکے، یہ موہوم سی امید یا یہ احساس کہ کوئی نہ کوئی اس کی مشکل کشائی کرے گا، چیخ کے ابلاغی رجحان کا ثبوت ہے - بچے اپنے لسانی ارتقا کے آغاز سے پہلے چیخ ھی سے کام لیتے ہیں، وہ اپنی ضروریات کا ابلاغ غوں غاں اور برجستہ جذباتی رد عمل کے ذریعے کرتے ہیں اور ارد گرد کے مانوس افراد کی توجہ اپنی طرف مرکوز کر لیتے ہیں اور اس طرح ماحول سے ابلاغی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں - جب بچہ غیر متوقع طور پر اکیلا چھوڑ دیا جاتا ہے تو وہ چیخ کر ماحول یا مانوس افراد کو غیرشعوری طور پر اس سے قریب ھونے یا اس کی کرب ناک کیفیت سے نجات دلانے

کی ترغیب دلاتا ہے - بےزبان بچوں کی چیخیں ابلاغ کے ارادے سے نہیں نکلتیں لیکن ان کی ابلاغی خصوصیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ چیخ کا تخاطب کسی خاص فرد سے نہیں بلکہ ماحول یا خارجی دنیا اور اس کے افراد سے ہوتا ہے لیکن بلاوے کا تخاطب کسی مخصوص فرد یا افراد سے ہوتا ہے ' اس کے لئے مخاطب کی جسمانی موجودگی نزدیک یا دور (اتنی دور کہ وہاں تک آواز پہنچ سکے) متلزم ہے - اسی لئے ''بلاوا'' یا ''پکار'' کی آواز اسی وقت ادا کی جاتی ہے جب مخاطب نظر کے سامنے ہو یا حد آواز کے اندر ہو - ''پکار'' (*Cali*) کی ماہرالامتیاز خصوصیت' اس کا وہ عنصر ہے جو تحکم آمیز ہوتا ہے یا جسے ''امر'' کی حیثیت دی جا سکتی ہے - جانوروں اوربچوں میں ایک طرح کی انانیت یا خود پسندی ہوتی ہے' جس کے تحت وہ اپنی خواہشات کی تسکین کے طالب ہوتے ہیں اس خود پسندی میں بھی تحکم آمیز عنصر ہوتا ہے - یہ عنصر ''پکار'' کی آواز کی مخصوص نہج سے بھی آشکارا ہوتا ہے - یہ اتنا واضع ہوتا ہے کہ بعض لوگ ''پکار'' کو ملفوظی زبان بھی کہہ دیتے ہیں - لیکن ہمیں جانوروں کی پکار اور انسانی زبان کی ابتدائی صورت میں بنیادی طور پر امتیاز کرنا چاہیئے - چیخ (*Cry*) اور ''پکار'' (*Call*) میں ان کی اصل کے اعتبار سے بھی بڑا فرق ھے - چیخ ' دوسری ابتدائی قسم کی ارتباطی آوازوں کی طرح جبلت کی تابع ہوتی ہے - جانور، ورثےمیں ملی ہوئی اور ایک خاص مقصد کے لئے کام کرنے والی فطری و جبلی میکانیت کے ذریعے وہ آواز نکالتا ہے، جو چیخ کہلاتی ہے - یہ میکانیت اسے اس مخصوص سمت راغب کرتی ہے جہاں وہ مطلوبہ مقصد کو محسوس کرتا ہے - اس کے برعکس ''پکار'' ذاتی تجربے سے وابستہ ہوتی ہے - جانور اور بچے اپنے تجربوں سے یہ سیکھتے ہیں کہ کن مخصوص افراد سے تخاطب ہونا چاہیئے - جانور محض ''پکار'' سے مطمئن نہیں ہوتا بلکہ نظروں یا حرکات و سکنات سے''مکانی اشارہ''

بھی کرتا ہے تا کہ اس کی خواھشات کی اور وضاحت ھو جائے - کسی عمل کی تحکم آمیز مبہم دعوت ''چیخ'' اور ''پکار'' دونوں میں ھوتی ہے - اول الذکر کی یہ دعوت کسی مخصوص فرد یا افراد کے لئے نہیں ھوتی بلکہ عمومی ھولی ہے - موخرالذکر کی دعوت مخصوص فرد یا افراد کے لئے ھوتی ہے - اس کے مخاطب کا تعین ھو سکتا ہے - کسی مخصوص فرد یا افراد اور سمت کی طرف نظریں اٹھانا حرکات و سکنات کا اظہار مخاطب کا تعین اور ''مکانی اشارہ'' ھی توہے' غیر لفظی ''پکار'' کے طریق عمل کا مشاھدہ بعض پالتو جانوروں کے بیوپار اور بچوں کے کردار سے ھو سکتا ہے - بچے گود میں لئے جانے یا گھوارے سے نکالے جانے کی خواھش کا اظہار کرنے کے لئے چیختے ہیں تو دونوں بازو کسی مخصوص فرد یا افراد کی طرف پھیلا کر ''مکانی یا ظرفی اشارہ'' بھی کرتے ہیں ان کی آواز ''چیخ'' سے ''پکار'' کا روپ دھار لیا کرتی ہے - یہ بھی مشاھدے میں آتا رھا ہے کہ بعض لوگ پالتو جانوروں یا بے زبان بچوں کو کسی کام سے روکنے کے لئے یا منع کرنے کے لئے کم و بیش ویسی ھی ''پکار'' اور حرکات و سکنات سے کام لیتے ہیں ' جیسی کہ وہ جانور یا بچے اپنی خواھش کے اظہار کے لئے استعمال کرتے ہیں - اس قسم کی ''پکار'' ابتدائی قسم کے غیر مشتق ''امر'' اور ''ندائیہ'' کی نمائندہ قرار دی جا سکتی ہے -

جانوروں کی نفسیات اس سوال کا دو ٹوک جواب دینے سے قاصر ہے کہ ابلاغ کی ان دونوں صورتوں یعنی ''چیخ'' اور ''پکار'' میں سے کسے تاریخی تقدم حاصل ہے - تاھم چیخ کی قدیم سی وضع کی بھونڈی اور غیر متفرق خصوصیت اور ''پکار'' کا نسبتاً ترقی یافتہ جانوروں تک مختص ہونا ' اس بات کی دلیل ہیں کہ آواز کی جوتفاعلی تبدیلی ''پکار'' پر منتج ھوئی اس کی پہلی مظہر ''چیخ'' ہونگی - انسانی

بچوں کے تجربے سے بھی چیخ کا تقدم ظاہر ہوتا ہے۔ بچوں کی ابتدائی اظہاری آوازیں تفاعلی تبدیلی سے ''چیخ'' کا روپ دھارتی ہیں اور آہستہ آہستہ ایک طرح کی تحکم آمیز ''پکار'' کی حیثیت میں ڈھل جاتی ہیں۔ مخبوط الحواس آدمیوں کی ذہنی حالت زیادہ خراب ہو تو وہ زیادہ سے زیادہ ''چیخ'' ہی سے کام لیتے ہیں اور اگر ذہنی توازن نسبتاً کم خراب ہو تو ان کی اظہاری آواز میں ''پکار'' کی خصوصیت نمایاں ہوتی ہے۔

لسانی ابلاغی ہیئتوں کے تاریخی تسلسل کا تعین کرنے کےلئے نطق انسانی کی مختلف ''چیخ'' یا ''پکار'' سے مدد نہیں مل سکتی۔ انسان کے تصرف میں ذرائع ابلاغ کی بہت سی نوعیتیں ہوتی ہیں جنہیں وہ حسب ضرورت استعمال کر سکتا ہے۔ اچھی خاصی ترقی یافتہ زبان استعمال کرنے والا شخص بھی ابلاغ کی وہ صورت اختیار کر سکتا ہے جو اس زبان کے مقابلے پر ارتقا کی نچلی منزل پر ہو جان جوکھم میں پڑنے تھک ہار جانے اور شل ہو جانے کے بعد جو ''چیخ'' منہ سے نکلتی ہے، اس میں صورت حال سے وقوف، چھٹکارے کی آس اور مطلوبہ صورت حال کی توقع تھوڑی بہت ضرور مضمر ہوتی ہے، اس لئے اس قسم کی ''چیخ'' کو ''پکار'' سے زیادہ قدیم نہیں کہہ سکتے۔

''چیخ'' اور ''پکار'' آغاز زبان کے معروضہ مدارج ہی نہیں بلکہ باقی رہ جانے والی ابلاغی ہیئتیں بھی ہیں۔ ابلاغ کی قدیم ترین صورتیں، جدید اور ترقی یافتہ صورتوں کی وجہ سے کا لعدم نہیں ہو جاتیں۔ اگر وہ زبان کے ماقبل تاریخ دور کی ترجمان ہیں۔ تو اب جب کہ زبان نے بہت زیادہ ترقی یافتہ صورت اختیار کر لی ہے، وہ کیوں مستعمل ہیں؟۔

''چیخ'' اور ''پکار'' اپنی بنیادی خصوصیات کے اعتبار سے بامعنی کلمے سے مختلف ہوتی ہیں ' اس لئے انہیں غیر لسانیاتی کہا جاتا ہے۔ غیر لسانی ذرائع ابلاغی اور بامعنی کلموں میں صوتی اشتراک ضرور ہوتا ہے لیکن صوتی ہیئت یا صوتی تمثال کے مواد میں اختلاف ہوتا ہے ۔ یہ اختلاف بامعنی کلمے کی علاماتی یا رمزی و ایمائی خصوصیات اور ''چیخ'' اور ''پکار'' کی اشاراتی یا ''سگنل'' کی خاصیت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ لسانی علامت کسی ''نشان'' (صوتی ہو یا ملفوظی) اور کسی مدلول میں رسمی اور قطعی تعلق قائم کرتی ہے ۔ اس کی ترجمانی کی خصوصیت' ترسیل، قبول و تبنیت (*adoption*) اور روایت پر منحصر ہوتی ہے ۔ لیکن یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں کہ انسان اپنی زبان میں حسب مرضی کسی صوتی تشکیل کا اضافہ کر سکتا ہے ۔ وہ فطری اور وہبی آوازوں کا پابند تو نہیں ہوتا اور ان آوازوں سے بالاتر بھی ہو سکتا ہے ۔ لیکن کلموں کی تشکیل پر غیر محسوس پابندیاں بھی ہوتی ہیں ۔ انسان کے تصرف میں جو صوتی مواد ہوتا ہے' اس سے کلمے تشکیل پاتے ہیں لیکن زبان کے رجحانات کے مسلسل اثرات اور باطنی لسانی احساس کے ماتحت ۔ کلمے ایسی تفاصیل کی ترجمانی کرتے ہیں ' جس سے ''چیخ'' یا ''پکار'' قاصر ہوتی ہے ۔ وہ ''پکار'' یا ''سگنل'' سے کہیں زیادہ پر 'معنی' جامع اور واضع ہوتے ہیں ۔ کلمات کے ذریعے دو یا دو سے زیادہ افراد میں ذہنی یا جذباتی مشارکت ہو سکتی ہے ۔

اس کے برعکس ''پکار'' محض ایک صوتی اشارہ ہے ۔ جسے غیر لسانی اشارہ (*Sign*) کہہ سکتے ہیں' کسی خواہش یا آرزو کا تحکم آمیز یا التجانا اشارہ ۔ وہ جیتی جاگتی اور مادی صورت حال کا براہ راست اور لازمی نتیجہ، ہوتی ہے ۔ اضطراری طور پر نکلی ہوئی

اظہاری آواز سے اس کا تعلق اس کی صراحت اور جذباتی نیز امری خصوصیت میں مضمر ہے۔ اس کا مقصد کسی مضطرب کیفیت کی تسکین یا کوئی ہنگامی تقاضا پورا کرانا ہوتا ہے، کسی لسانی جواب کی توقع نہیں ہوتی، اس لئے وہ یک طرفہ ہی ہوتی ہے۔ یک طرفہ اور واضح امری خصوصیت کی وجہ سے، کوئی بھی سگنل کا نظام، خواہ وہ کتنا ہی پیچیدہ ہو دو افراد کی باہمی ذہنی و جذباتی مشارکت کا ضامن نہیں ہوسکتا۔ سگنل دینے والا اور وصول کرنے والا، جذباتی اور ذہنی اعتبار سے ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ محض ہنگامی مادی و محسوس صورت حال ان کے درمیان مختصر سے وقفے کے لئے رابطہ پیدا کردیتی ہے۔ آج بھی جبکہ انسانی زبان ترقی کے مدارج طے کرچکی ہے، اس قسم کی صورت حال میں سگنل کے ذریعے پیغام رسانی کا کام لیا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اب ترسیلی روایت کی بدولت ''سگنل'' کا کام محض ''امر'' تک موقوف نہیں بلکہ بیانیہ اور ابلاغی بھی ہوتا ہے۔ ''سگنل'' کی اس قسم کی صورتوں کے ڈانڈے آغاز زبان کی تاریخ سے ملا کر، قدیم ترین ابلاغی ہیئت قرار دینا اور نطق انسانی کی اولین منزل سمجھنا درست نہیں۔ ہاں وہ فطری سگنل جن کی بنیاد چیخیں ہیں، تخلیقی نفسیات میں اہمیت رکھتے ہیں اور انہی کو زبان کی ماقبل تاریخ سے مربوط کیا جاسکتا ہے۔ قدیم ترین قومیں جو ثقافتی اعتبار سے دور وحشت کی نمائندگی کرتی ہیں، بہت حد تک ابلاغ کے لئے یہی صورتیں اختیار کرتی ہیں۔ کسی اچانک پیدا ہونے والی صورت حال میں برجستہ نکلی ہوئی چیخ یا پکار میں اس کی دقیانوسی پرانی بنیاد نمایاں ہوتی ہے۔ بچوں کے زبان سیکھنے سے پہلے کے دور میں بھی اس کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ ان تمام حقائق کے پیش نظر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ قدیم ترین انسان نے زبان کی علاماتی ہیئت کے اکتساب سے پہلے اپنی ضروریات اور تقاضوں سے دوسروں کو آشنا کرنے اور حاجتوں کی تسکین کی توقع میں تحکم آمیز یا ''امری'' پکار سے (جس کو ایک طرح کا سگنل کہہ سکتے ہیں)

کام لیا ہوگا ۔

''چیخ'' اور ''پکار'' سے کلموں تک کے ارتقائی سفر کا اندازہ بچوں کے لسانی ارتقا سے ہوسکتا ہے ۔ بچے کی عمر کے دوسرے سال ہی کے آغاز سے ہم یہ مشاہدہ کرسکتے ہیں کہ بچے کی آواز بتدریج چیخ سے پکار (Call) اور پھر غوں غاں اور ٹوٹی پھوٹی صوتی تشکیل' فطری آوازوں کی نقل سے بچگانی زبان تک ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے ۔ تہذیب و تمدن سے نا آشنا قدیم ترین قومیں آج بھی دنیا کے بعض حصوں میں ملتی ہیں ۔ ان کے افراد کسی اچانک وقوع سے پیدا ہونے والی صورت حال کے جذباتی رد عمل کا اظہار ایسی اضطراری اور برجستہ آوازوں سے کرتی ہیں۔ جنھیں لسانی منطوقات نہیں کہہ سکتے ۔ اسی قسم کے ہرموقع پر ان آوازوں کا خالق انہی آوازوں کو دہراتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کے ہم قوم کے لئے ابلاغ کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے ۔ اور پھر وہ ان آوازوں میں ایسی تبدیلیاں بھی پیدا کرلیتے ہیں کہ ان کے باطنی لسانی احساس سے مطابقت پیدا ہوسکے' پھر یہی آوازیں بتدریج پوری قوم میں استعمال ہونے لگتی ہیں ۔ ''پکار'' (Call) اور کلمے کا درمیانی رشتہ انہی آوازوں میں تلاش کیا جاسکتا ہے ۔ لیکن ماقبل زبان آوازوں میں لسانی ساخت کی کوئی قواعدی صورت نہیں ہوتی نہ کوئی مخصوص صوتی نظام ہوتا ہے اورنہ کسی تشکیلیاتی یا صرفی اور نحوی قاعدے کی پابندی ۔

غرض یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابلاغی ہیئتوں کے نظام میں تحکم آمیز یا امری پکار (Imperative Call) کومخصوص حیثیت دی جاسکتی ہے۔ یہ ابلاغی ہیئت بھونڈی اورغیرمکتفی تو ہوتی ہے تاہم اس میں انسانی زبان کی ایک بنیادی خصوصیت کسی قدر ضرور ہوتی ہے اور وہ ہے بین الافرادی رابطے کا رجحان۔امر کا تفاعل بتدریج بیانیہ تفاعل کی حیثیت اختیار کرتا جاتا ہے یہ ایسا اظہاری وسیلہ ہے جو آج بھی انسان کی خدمت سر انجام دے رہا ہے۔

تحکم آمیز یا امری پکار کے تخلیقی ارتقا کی اہمیت غیر متوقع طور پر زبان کے دائرے کے باہر بھی نظرآتی ہے۔ اس نے زبان کے آغاز کے سلسلے ھی میں نمایاں کردار ادا نہیں کیا ہے بلکہ نغمے کے آغاز کے ضمن میں بھی اہم حصہ لیا ہے۔یہ مفروضہ بے بنیاد نہیں کہ قدیم ترین انسان مختلف مقاصد کے لئے مختلف قسم کی ''چیخ'' یا پکار سےکام لیتا تھا۔ بعد مکانی پر قابو پانے کے لئے اس نے ایسی چیخ یا پکار سے بھی کام لیا ہوگا جن میں معمولی پکار کے سلیبل سے اور کسی قدر با معنی کلموں سے ملتی جلتی آوازیں شامل ہوں گی۔ آج بھی قدیم قوموں کے بہت سے افراد ایسی آوازوں سےکام لیتے ہیں ۔ ان آوازوں کے زیروبم اور ''دوران'' کو معمولی چیخ یا معمولی پکار کے زیروبم اور ''دوران'' سے ممتاز کیا جا سکتا ہے ان کےتجزئیے سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ دو مختلف قسم کی آوازوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور ان کے درمیان معینہ اور نسبتاً طویل وقفہ ہوتا اور لہجہ بتدریج دھیما ہوتا جاتا ہے۔ دور تک پہنچانے کے لئے جو آواز نکالی جاتی ہے اس کے اتار چڑھاؤ کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ بتدریج لہجہ پر زور ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ دھیما ہوکر ڈوب جاتا ہے۔ اتار چڑھاؤ کی یہ کیفیت اور مختلف قسم کی آوازوں کے درمیان معینہ وقفہ' آوازوں کا دوران' یہ سب مل کر ایک طرح کا غنائی انداز پیدا کردیتے ہیں۔ قدیم قوموں کے گیتوں میں آواز کا اسی طرح کا اتار چڑھاؤ ملتا ہے۔ یہ اور بات ہےکہ اب ان گیتوں کا وہ تفاعل نہیں رہا جو ''پکار'' سے مختص ھے۔ کسی زمانے میں ان گیتوں کے اجزا پکار (*Call*) کی حیثیت ھی رکھتے ہوں گے۔ اسی لئے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا رہاہے کہ ''پکار'' اور ''نغمے'' میں قریبی رابطہ رہا ھے۔

رے ویز کا یہ استنباط کہ ''پکار'' نے نغمے کے آغاز کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا ہے' صرف اس مماثلت پر منحصر نہیں ہے جو ''پکار'' کی غنائی ساخت اور قدیم ترین نغموں میں

پائی جاتی ہے بلکہ پہاڑی باشندوں کی ''پکار'' اور مزدوروں کے گیتوں میں جو غنائی ترکیبیں ملتی ہیں، ان پر بھی اس کا انحصار ہے۔ اس کا یہ خیال ہے کہ جس قدیم دور میں انسان نغمے سے بھی محروم تھا، اس دور کے اور آغاز نغمہ کی اولین صورتوں کے دور کے درمیان جو خلا ہے، اسے ''پکار'' ہی سے پر کیا جاسکتا ہے۔ گویا نطق انسانی اور نغمہ، دونوں کی پیش رو، ''پکار'' ہی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ''پکار'' نے لسانی خصوصیت پہلے اختیار کی اور نغمے کا ارتقا نسبتاً بعد میں ہوا۔ اس کا تعلق انسانی ارتقا کے ماقبل لسانی دور سے ہے۔

اس بحث کے ساتھ ساتھ یہ سوال بھی ابھرتا ہے کہ آخر غیر کلماتی ''پکار'' نے کلماتی دور میں کس طرح قدم رکھا اور کلمات کیوں کر وجود میں آئے۔

ترکیبی ونامیاتی وقوع میں ارتقائی تغیرات سے متعلق جو نظریہ تسلیم کیا جاتا ہے، اس کی رو سے یہ ممکن ہے کہ ''پکار'' کو کلمے کی منزل پر پہنچنے کے لئے ان گنت عبوری ادوار سے گزرنا پڑا ہو اور یہ ادوار ایک مسلسل ارتقائی زنجیر کی مربوط کڑیوں کی صورت رکھتے ہوں۔ لیکن یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آیا اب تک کی معلومات اور ان سے ابھر نے والے نظریاتی مباحث کی بنیاد پر ''پکار'' سے ''کلمے'' تک کے ارتقا کو تدریجی قرار دینا درست ہے یا ارتقائی منزلوں کو وقفہ دار اور ارتقائی جست کا نتیجہ سمجھنا صحیح ہے۔ یہ سوال نفسیاتی ارتقا کے نقطۂ نظر سے دل چسپ ضرور ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ کوئی ایسا مواد ناپید ہےجس سے کسی قسم کی کوئی شہادت مل سکے۔ اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ عبوری ہیئتوں کا وجود رہا ہے، تو اب چوں کہ انکا وجود نہیں رہا، اس لئے انہیں یا ان میں سے کسی کو ثبوت کے طور پر پیش کرنا ممکن نہیں۔ بچوں کی نفسیات اور علم الانسان کی مدد سے ان امکانی ہیئتوں کی تشکیل جدید بھی ناممکن ہے۔ ہاں اس سوال کا معقول حل تلاش کرنے کے لئے ایسا ارتقائی مفروضہ تشکیل

کیا جائے جو منطقی بھی ہو اور واقعاتی بھی سمجھا جاسکے۔ لیکن ایسے مفروضے کی تشکیل سے پہلے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ارتقا کا کون سا تصور مراد لیا جائے۔

ارتقا ایک ایسی تبدیلی ہوتی ہے جسے تبدیلی کی تمام اقسام سے سمیز کیا جاسکتا ہے۔ تبدیلی کیفی بھی ہوسکتی ہے مثلاً سرخ کا زرد ہو جانا۔ حرکت اور مکانی پھیلاؤ بھی ایک قسم کی تبدیلی ہے۔ روشنی کا تیز تر ہونا بھی ایک طرح کی تبدیلی ہے۔ جس تبدیلی کو ارتقا سے موسوم کرتے ہیں، وہ ان سب سے مختلف ہے۔ کم متفرق حالت سے زیادہ متفرق حالت میں تبدیلی، ہی بالیدگی، نشوونما اور ارتقا کہلاتی ہے، جس میں ایک طبعی و خلقی منصوبہ بالیدگی کے عمل میں ڈھل کر پایۂ تکمیل کو پہنچتا محسوس ہوتا ہے۔ ارتقا لازماً غایتی بھی نہیں ہوتا۔ اصولاً ارتقا کا تصور آہستہ آہستہ بڑھنے اور ترقی کرنے پر محیط ہے اور تدریجی انحطاط اور رجعت پر بھی لیکن عام طور پر اس کا پہلا مفہوم ہی میں مراد لیا جاتا ہے یعنی ناقابل ادراک اور غیر محسوس مدارج کے ذریعے مسلسل ترقی اور نشوونما۔ جب کوئی جسم نامی اپنی صوریاتی اور تفاعلی ترقی کے ذریعے اس قابل ہوتا ہے کہ اپنے عمل اور فریضے کا دائرہ وسیع تر کرسکے اور اپنی صلاحیتوں اور زندگی کے روز افزوں تقاضوں میں مطابقت پیدا کرکے ان تقاضوں سے عہدہ بر آ ہو سکے تو کہا جاتا ہے کہ وہ جسم ارتقا کررہا ہے۔ منطقی طور پر اور واقعاتی حیثیت سے ارتقا کے محدود اور وسیع، دونوں تصورات کا جواز پیش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن چوں کہ ارتقا کا محدود تصورہی زبان کی زندگی کے مروجہ تصور سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے، اس لئے زبان کے ارتقا کے ضمن میں وہی مراد لیا جانا چاہیئے۔

کسی جسم نامی کی حیاتیاتی بالیدگی کی ایک وجہ تو وہ مرکزی حیاتی قوتیں ہوتی ہیں جو اس جسم کے باطن میں مخفی ہوتی ہیں اور دوسری کا تعلق خارجی عوامل سے ہوتا ہے۔ اول الذکر ہی سے جسم میں

تدریجی تبدیلی کا رخ متعین ہوتا ہے اور دوسری معین و معاون ہوتی ہے' اسے ثانوی حیثیت ہی دی جاسکتی ہے۔ اگر بالیدگی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی تو اس نوع کے تمام اجسام یا افراد میں تبدیلی کی نوعیت' نہج اور رفتار یکساں ہی ہوتی ہیں۔انسانی جنین بالیدگی پا کر انسان کا روپ دھارتا ہے' لاروا نشو و نما پاکر مخصوص کیڑا ہی بنتا ہے۔ اور آنکھ پروان چڑھ کر نوری و مکانی ادراک کا آلہ ہی بنتی ہے۔ اگر انسانی جنین' انسان کا روپ نہ دھارسکے یا کوئی غیرمعمولی صورت اختیار کرلے' تو اس کی وجہ فطری بالیدگی میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ یا خرابی ہی ہوسکتی ہے' آنکھ بصارت سے محروم ہو تو اس کا سبب کوئی غیر معمولی شاخسانہ' بالیدگی میں کسی رکاوٹ سے پیدا ہونے والا نقص ہوسکتا ہے' ورنہ اصول ارتقا کی رو سے ہرجسد نامی کی نشوونما نوعی افراد میں یکساں ہی طور پر ہوتی ہے۔ خارجی عوامل کی وجہ سے افراد کی کمیت میں تھوڑا بہت فرق رہ سکتا ہے' نوع نہیں بدلی جاتی۔ جسدی نظام میں بالیدگی کی نہج کوغیر منقطع سمجھا جاتا ہے اور بالیدگی یا ارتقا کو آگے کی طرف ایک مسلسل بہاؤ کی حیثیت دی جاتی ہے۔ اس تصور میں ارتقا کی ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف جست کا شائبہ نہیں ہوتا۔ یہ فرض کیا جاتا رہا ہے کہ بالیدگی کے دوران' ہیئت اور فریضہ و تفاعل کی تبدیلیاں ناقابل ادراک مدارج کے ذریعے ہوتی ہیں۔ اس مفروضے میں یہ بھی مضمر ہے کہ ارتقا کی اگلی سیڑھی' پچھلی سیڑھی سے اندرونی شواھد کے ذریعے اخذ کی جاسکتی ہے۔ بالیدگی کے غیر منقطع تسلسل کا اطلاق' نباتاتی اور حیوانی دونوں عالم پر کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن وقت کے قابل ادراک چھوٹے چھوٹے وقفوں میں تبدیلی کے غیر منقطع تسلسل کی تشریح و توضیح تجرباتی مثالوں کے ذریعے یا کسی اور طرح سے نہیں ہوسکی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تسلسل کے اصول کا اطلاق' ناقابل تردید مشاہدہ کردہ حقائق کی تعمیم کی بنیاد پر نہیں بلکہ اس مفروضے کی بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ ہم

ارتقا کی جن غیر منقطع لمحاتی سیڑھیوں کا مشاہدہ کرتے ہیں وہ ان گنت عبوری سیڑھیوں کے طفیل مربوط ہوجاتی ہیں ارتقا کے تسلسل اور بہاؤ کا جو تاثر ہم قبول کرتے ہیں اس کی مثال سینما کی متحرک تصویروں سے دی جا سکتی ہے۔ فلم کی ''ریل'' بہت سی تصویروں پر مشتمل ہوتی ہے ہر تصویر ایک علیحدہ جزو کی حیثیت رکھتی ہے لیکن جب پردہ سیمیں پر فلم دکھائی جاتی ہے تو اس کا ہرجزو علیحدہ علیحدہ نہیں معلوم ہوتا۔ مشین کی تیز حرکت ان اجزا کے عکس میں تسلسل اور بہاؤ کی کیفیت پیدا کردیتی ہے اور پوری فلم کسی واقعے کی چلتی پھرتی، جیتی جاگتی پرچھائیں بن جاتی ہے۔ گویا منقطع اجزا میں ایک طرح کا تسلسل پیدا ہوجاتا ہے اور ان کے درمیان جووقفہ ہوتا ہے وہ اتنا خفیف ہوتا ہے کہ اس کا ادراک ممکن نہیں۔ یہ تسلسل اوربہاؤ تیز رفتار ہی کا نہیں بلکہ ہمارے حواس کا بھی کرشمہ ہے۔ تسلسل کا یہ احساس اپنی جگہ ہے اور فلم کی تصویروں کی جداگانہ حیثیت کی حقیقت اپنی جگہ۔ تسلسل کے احساس کی وجہ سے فلم کے مختلف اجزا واقعی مربوط ہوکر ارتقا کے مسلسل بہاؤ نہیں بن جاتے۔ بہ ظاہر غیر منقطع تسلسل کے ادراک اور تبدیلی کے سلسلے وار بہاؤ کے عقیدے کی وجہ سے حقیقت کی ماہیئت نہیں بدل سکتی۔ مشاہدے سے مستنبط تسلسل کا تصور طبیعات کی نئی تحقیقات کی روشنی میں بے بنیاد ثابت ہوتا ہے۔ ماہرین طبیعات یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوچکے ہیں کہ سالماتی حرکت سے پیدا ہونے والے مظاہر، اس انقطاع کا ثبوت فراہم کرتے ہیں جو الگ تھلگ رہنے والے سالموں کے تصادم کی نمایاں خصوصیت ہے ایٹم کی حرکات مسلسل اور غیر منقطع نہیں ہوتیں۔ قیاس تمثیلی سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حیاتیاتی ارتقا کی کیفیت بھی ایسی ہی ہوسکتی ہے۔ اگرچہ جسدی و عضوی ارتقا کے سلسلے میں عدم تسلسل یا انقطاع کا تجرباتی ثبوت تو پیش نہیں کیا گیا تاہم اس کے امکان کو بے بنیاد قرار دینا بھی دشوار ہے کیوں کہ تسلسل کا تصورصرف مشاہدے ہی

کا نہیں بلکہ نظریاتی ملحوظات کا بھی مرہون منت ہے۔ اگر صرف مشاہدے پر سوفی صد انحصار بھی ہوتا تو بھی مشاہدے کی عدم صحت کا امکان نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مشاہدے کی صحت کی عملی توثیق کا قطعی ذریعہ بھی محل نظر ہوسکتا۔تھا اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ارتقا کے سلسلے میں تسلسل کا مروجہ تصور منطقی اور ٹھوس بنیادوں پر استوار نہیں ہوا ہے۔

”جب ایک جسدی اکائی میں بالیدگی کے عدم تسلسل اور انقطاع کا امکان ہوسکتا ہے تو نسلی ارتقا میں اس کا امکان کہیں زیادہ ہوسکتا ہے۔ نسلی دنیا میں تو عدم تسلسل کے مفروضے کی تجرباتی توثیق بھی ہوچکی ہے۔ اسی لئے **هیوگوردا وراٹز** (Hugo da Vries) نے **ڈارون** کے نظریہ ارتقا کے مقابلے پر وراثت کے اچانک تغیر کا نظریہ پیش کیا ہے۔ **ڈارون** نے بھی بہت سی مثالوں میں تدریجی تغیرات کے ساتھ ساتھ اچانک تغیر کا اعتراف کیا ہے۔ **ڈارون** کی رائے میں چھوٹے چھوٹے ان گنت تغیرات کے اجتماع اور درمیانی ارتقائی کڑیوں کے ایک دوسرے سے انتہائی قرب کی وجہ سے عدم تسلسل بہت خفیف بلکہ بے معنی ہوجاتا ہے۔ اس کے برعکس انقلاب نوعی کے نظریئے کی رو سے فطری واقعات میں اچانک تبدیلی بین طور پر نظر آتی ہے اور عام اہمیت رکھتی ہے۔ اگر ایک طرف تمام حیوانی اور نباتی ارتقا کو بلا استثنا تدریجی کڑیوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا اور دوسری طرف افراد انسانی خصوصاً بچوں کے ذہنی ارتقا میں دفعتاً تبدیلی عموماً واقع ہوتی ہے تو نئی ہیئتوں اور وظائف (Functions) کے اچانک ظہور پزیر ہونے کے نظریئے کا اطلاق عام انسانی ذہن کے ارتقا پر کیوں نہیں ہوسکتا؟ جب حیاتیاتی شعبوں پر تدریجی اور مسلسل ارتقا کے عموی اصول کا اطلاق بھی استثنا سے مبرا نہیں یا سو فی‌صد درست نہیں تو ثقافت انسانی کے متعلقات پر اس کا اطلاق پورے وثوق اور صحت کے ساتھ کیوں کر ہوسکتا ہے؟ غیر شعوری اجتماعی اندرونی قوتیں ہی انسان کے ذہنی

ارتقا کی رہ نمائی نہیں کرتیں بلکہ انسان کا تخلیقی عمل جو وقت کی تبدیلی کے دوران ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے اور پچھلی نسلوں کی روایات بھی ارتقا کے رجحان پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان شعبوں میں ہمیں جو تجربے ہوتے رہے ہیں وہ مسلسل ارتقا کے تصور کی توثیق نہیں کرتے استحکامی حالت اور دھچکے دار تبدیلی میں تبادل کی توثیق ضرور ہوسکتی ہے۔ وجود پذیری کے عمل اور مسلسل تبدیلی کی حالتوں کے اضطرار میں پرسکون وجود کے وقفے بھی ہوتے ہیں، خواہ وہ کتنے ہی خفیف ہوں

تخلیقی ارتقا کا تصور خواہ اس کا تعلق عالم فطرت سے ہو یا عالم ذہن سے، عدم تواتر کے اصول سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ جب تک ارتقائی عمل میں تسلسل ہوتا ہے، تخلیقی عمل کو بالیدگی کے عمل میں کار فرما ہونے کا موقع نہیں ملتا ۔ ارتقائی عمل کی غیر تغیر پذیری اور ایک خاص منصوبے یا فارمولے کے تحت بالیدگی، کسی تخلیقی عمل میں رکاوٹ ہی ہوسکتی ہے۔ اس کے برعکس عدم تواتر اور اچانک تخلیقی تغیر کے ساتھ ان نئی قوتوں کا اجتہاد مستلزم ہے جو ارتقائی عمل کے تسلسل کی وجہ سے بے اثر ہوتی ہیں کیوں کہ ان کے اجتہاد کے بغیر اچانک نوعی تبدیلی، ترمیم اور ارتقائی رخ کے تغیر کا امکان نہیں ہو سکتا ان نئی قوتوں کو تخلیقی ارتقا کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے۔ تخلیقی عمل کلی طور پر ماقبل صورت حال سے ماخوذ نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو اسے ''تخلیقی'' کہنے کا کوئی جواز نہ ہوتا۔

اگر اس زاویہ نظر سے زبان کے ارتقا کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ارتقا میں عدم تسلسل اور اچانک تغیرات جنھیں جزوی طور پر افراد کی تخلیقی صلاحیتوں کا مرہون منت قرار دیا جاسکتا ہے بچوں کی زبان ہی میں نہیں بلکہ نئی زبانوں کے اکتساب اور لسانی تاریخ میں بھی ثابت کئے جاسکتے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زبان کے انفرادی اور نسبی ارتقا کا رخ عمومی قوانین مثلاً صوتی تبادل صوتی انحراف، تفاعلی تبدیلی، قواعدی شقوں کے امتیازات وغیرہ سے متعین

ہوتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زبان کا ارتقا عدم تسلسل اور وقفہ دار خصوصیت کا مظہر ہے۔ زبان کے ارتقا میں افراد، اور سماج کی تخلیقات اور پہل کاری جو اہم کردار ادا کرتی ہیں، انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور انہی تخلیقات کی وجہ سے اچانک تغیرات رونما ہوتے ہیں۔

اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ الفاظ کا ارتقا تبدریج حیوانی آوازوں سے ہوا ہے، تو ان دونوں کے درمیانی مراحل کا تصوربھی دشوار ہوگا لیکن اگر انسانی چیخ اور بلاوے کو زبان کا نقطۂ آغاز قرار دیا جائے تو درمیانی مراحل کے قیاس کی دشواری نسبتاً کم ہوگی۔ قدیم ترین اقوام کی روایتی، خصوصاً برجستہ بلاوے کی آوازوں اور بچوں کی ماقبل نطق دور کی چیخوں کے محتاط تقابل سے عبوری ادوار کے لسانی مراحل کی تشکیل جدید ناممکن نہیں۔ اس طرح کی تحقیق سے بلاوے اور لفظ کی مظہری مماثلت واضح کی جاسکتی ہے۔ اس تحقیق سے یہ بھی ثابت کیا جاسکتا ہے کہ خطابی بلاوا اہم صوتی خصوصیات کے اعتبار سے قدیم الفاظ اور مادوں سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ ان خارجی مماثلتوں میں لفظ غیر لسانی ہیئتوں سے لسانی ہیئتوں کی طرف مسلسل ارتقا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ تاریخ لسانیات میں نطق انسانی سے پہلے کی غیر لسانی آوازوں کی تشکیل جدید کی کوششیں تو کی گئی ہیں لیکن آواز کی الفاظ میں، جذبات کی علامات میں اور امری تفاعل کی لسانیاتی تفاعل میں منتقلی کی عبوری کیفیات کا خاکہ نہیں پیش کیا جاسکا۔ اگر اس مسئلے کا جائزہ لیتے وقت ابلاغ کی دونوں صورتوں (غیر لسانی اور لسانی) کی صوتی ماہیئت ہی نہیں بلکہ اُن کی اندرونی ساخت، علاماتی خصوصیات اور زبان کے ذہنی متن (*Mental Contents*) پر بھی غور کیا جائے تو یہ واضح ہوجائے گا کہ ایک طرح کے بر جستہ تخلیقی عمل کا مفروضہ ناگزیر ہے۔ اس مفروضے سے یہ استنباط بھی کیا جاسکتا ہے کہ ارتقائے لسان میں کسی نہ کسی طرح کی اچانک جست بھی ضرور ہوتی ہے۔

زبان، باطنی ضرورت کے ماتحت قدیم ترین غیر لسانی بلاووں (*Non Linguistic Calls*) سے نمو نہیں پا سکتی تھی کیوں کہ اگر ایسا ممکن ہوتا تو عام حیوانی دنیا غیر لسانی ذرائع ارتباط تک محدود ہو کر نہ رہ جاتی۔ بلاوے (*Calls*) خود بہ خود زبان پیدا نہیں کرسکتے۔ **رے ویز** کی یہ رائے ہے کہ نئے تہیج، نئی تحریک اور نئی تخلیقی صلاحیتیں ہی نطق انسانی کے اولین اظہار کے موجب ہوسکتے ہیں۔ یہ مفروضہ غلط نہ ہوگا کہ زبان کے آغاز ہی سے انسان کے تخلیقی عمل نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے اور انسان کے انسانی خصائص سے متصف ہونے کے اول ترین دور سے ضروریات، خواہشات، اور خیالات کو ممتاز ہی نہیں بلکہ موسوم کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔آسان ابلاغ کے لئے مختلف آوازوں کو ذریعہ اظہار بنایا گیا۔جس فرد سے ضرورت یا خواہش کی تکمیل کی توقع تھی، اس کو مخاطب کرنے کے لئے ان آوازوں کا سہارا لیا گیا۔ اس طرح خطابی بلاووں کی ابتدا ہوئی۔ اس صوتی عمل کی نمایاں خصوصیت بے ساختگی اور برجستگی تھی۔پکار یا بلاووں (*Calls*) میں جو صوتی مواد ہوتا ہے، ان کی امری اور ظرفی (*Imperative & Locative*) خصوصیات کی وجہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ابتدائی نطق انسانی کی تشکیل میں ممدو معاون ہوسکتا ہے۔

رے ویز نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ شروع شروع میں چیخیں (*Cries*) پکار یا بلاوے اور قدیم ترین کلمے خلط ملط ہوگئے ہوں گے البتہ ان میں چیخوں اور پکار کا غلبہ ہوگا۔آہستہ آہستہ چیخوں اور بلاووں کی جگہ ابتدائی کلمے لیتے گئے لیکن غیر لسانی بلاوے دور کے ارتباط کا ذریعہ ضرور بنے رہے۔ ابتدائی کلمے تجرباتی منزلوں سے گزرتے رہے ان میں حک و اصلاح، تراش خراش ہوتی رہی اور وہ مقبول یا متروک ہوتے رہے اس طرح زبان کے ارتقا کی اولین راہیں ہموار ہوئیں۔ ان مباحث کے پیش نظر بلاوے کو غیر لسانی ابلاغ کا نقطۂ عروج اور لسانی ابلاغ کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاسکتا ہے۔

امری اور ظرفی خصوصیات رکھنے والے بلاوے اور قدیم ترین کلموں کے درمیانی مراحل کی نشان دہی ممکن نہیں۔اگر ہم ان مراحل کی ماہیئت کا اندازہ لگانا چاہیں تو ہمیں یہ حقیقت ملحوظ رکھنی ہوگی کہ ابتدائی کلموں کے اظہار اور ان کے نمایاں اور ممتاز سیاق و سباق میں استعمال کےلئے ایسے ذہنی عالم کا مستلزم ہونا بھی ضروری ہے جس کا ماقبل مراحل سے موازنہ نہیں ہوسکتا۔جو چیزیں زبان کو غیر لسانی ذرائع ابلاغ سے ممتاز کرتی ہیں، وہ اس کی صوتی اور ساخت کی ماہیئت، اس کی تفاعلی صلاحیت، اس کا وسیع دائرہ عمل اور اس کا انسانی شخصیت اور سماج سے گہرا تلازمہ وغیرہ ہی ہوسکتی ہیں۔

جب بلاوے کی امری خصوصیت کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ امری بلاوے میں گرامر کے اعتبار سے امر کی خصوصیت ہوتی ہے۔ اس سے مراد صرف امری رجحان ہے' جو آواز کے ذریعہ سے ہی مکمل طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ امری بلاوے اور قواعدی امر میں مماثلت ان کی خارجی ہیئت' اور متن کی تخصیص کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے تفاعل' ارادے اور اثر کی وجہ سے قرار دی ہے۔ ابتدا میں مبہم اور محدود سے امری بلاووں کو متنوع لسانی امری اظہار میں منتقل کرنے میں بہت سی دشواریاں بھی پیش آئی ہوں گی۔ قدیم سردار کو اپنے خاندان یا قبیلے کے افراد کو مختلف کاموں پر آمادہ کرنے یا مجبور کرنے کے لئے آوازوں کی ترکیب سے نت نئے امری بلاوے وضع کرنے پڑتے ہوں گے' آہستہ آہستہ تجربے سے ان کی تخصیص ہوتی گئی ہوگی اور یہ بلاوے' امری کلمات کی حیثیت اختیار کرتے گئے ہوں گے۔ اس دور میں کچھ اور کہنے اور بیانیہ انداز اختیار کرنے کی ضرورت نے انگڑائی بھی نہ لی ہوگی۔

لسانی اظہار کی تمام ہیئتوں میں ''امر'' کو مقدم حیثیت حاصل ہے۔ لسانی ارتقا کی پہلی منزل''امر'' کی ہے۔ مشاہدے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بچہ سب سے پہلے امر کے صیغوں ہی کو سمجھتا ہے اور سال

سوا سال کی عمر میں کسی نہ کسی ایسے کلمے سے بولنے کی ابتدا کرتا ہے، جس کا تعلق امر کے صیغے سے ہوتا ہے۔ اس کے ابتدائی کلمے اس کی طلب کا اظہار کرتے ہیں اور سننے والوں کو کسی نہ کسی اقدام پر آمادہ کرتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد طلب اور آرزو کا اظہار کرنے والے کلموں کی جگہ بیانیہ کلمے بھی استعمال کرنے لگتا ہے اور آہستہ آہستہ بیانیہ کلمے زیادہ ہوتے جاتے ہیں ابتدائی کلمے بنیادی طور پر اسم ہوں، یا فعل یا فجائیہ تفاعل کے لحاظ سے امر ہی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ جب بچہ ''ما'' ''با'' 'پا' ''اما'' ''ابا'' کہتا ہے تو اس کا مقصد ماں یا باپ کی موجودگی کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ وہ اس جانی پہچانی شخصیت سے کوئی کام لینا چاہتا ہے اسی طرح جب وہ کسی چیز کا نام لیتا ہے تو اس چیز سے متعلق کچھ کام کرانا چاہتا ہے ۔ چیزوں کو موسوم کرنے کا ارادہ تو عموماً ڈیڑھ سال کی عمر کے بعد ہی انگڑائی لیتا ہے۔ اگر ہم بچوں کے ابتدائی کلموں کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ کلمے کسی بھی صیغے سے تعلق رکھتے ہوں، بچہ انہیں امر کے طور پر ہی استعمال کرتا ہے، ان کے استعمال کا مقصد کوئی نہ کوئی عمل، کسی خواہش کو پورا کرنے کی آرزو، کوئی التجا یا کوئی ''امر'' ہی ہوتا ہے۔ بعد میں آہستہ آہستہ ان کا محل استعمال سیکھ لیتا ہے۔ قدیم ترین زبانوں کا بھی یہی حال ہے۔ ان میں اسما، افعال اور صفات میں کوئی خاص حد فاصل نہیں ہوتی، خصوصاً اسما اور افعال میں بمشکل تمیز کی جا سکتی ہے۔ کلمہ اسم ہو یا فعل عموماً تفاعل کے لحاظ سے ''امر'' ہی ہوتا ہے۔ ڈیڑھ دو سال کے بچوں کی ٹوٹی پھوٹی زبان پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ وہ ''مصادر'' سے بھی ''امر'' کا کام لیتے ہیں۔ ''امر'' کے بعد ''مصدر'' کے استعمال کی مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زبان کے ارتقا کی پہلی کڑی ''امر'' ہے اور دوسری ''مصدر''، یہ اور بات ہے کہ ''مصدر'' بیشتر ''امر'' کے مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے۔

تقابلی لسانیات کی تاریخ میں بھی ''امر'' کے تقدم کی حمایت کے ثبوت ملتے ہیں۔ سب سے پہلے فرانسیسی ماہر لسانیات *Scaliger* نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا **ونٹ** (*Wand*) **ایف۔ماتھنر** (*F. Mauthner*) وغیرہ نے اس کی پیروی کی۔ تقابلی گرامر اور سنسکرت کے فرانسیسی ماہر **ایم۔برے ال** (*M Breal*) نے لسانی شواھد اور نفسیات کی بنیاد پر ''امر'' کو قدیم ترین لسانی اظہار قرار دیا ہے۔ قدیم سامی زبان میں فعل کا قدیم ترین روپ یک رکنی امر ھی ھوتا تھا اور فعل کے دوسرے روپ اسی سے منصرف ھوتے تھے۔ صرفی طور پر عام طور سے ''امر'' مادے کے مماثل ھوتا ہے۔ اکثر زبانوں کے بیشتر مادے ''امر'' ھی ھوتے ہیں۔ اس حقیقت سے بھی ''امر'' کی قدامت واضح ھوتی ہے۔ زبان ارتقا کی کتنی ھی منزلیں طے کرلے ''امر'' کا صیغہ ناپید نہیں ھوجاتا۔ فعل کے دوسرے روپ تبدیل ھوسکتے ہیں' ان کی جگہ کوئی اور ھیئت لے سکتی ہے' یا دوسرا روپ اس کے مفہوم میں استعمال ھو سکتا ہے۔ ''امر'' کے تفاعل میں قطعیت ھوتی ہے' دوسرے روپوں کے تفاعل متعدد ھوسکتے ہیں۔ ماضی' مضارع یا مستقبل کے مفہوم میں استعمال ھو سکتا ہے مثلاً اگر 'وہ آیا' تو میں اس سے پوچھوں گا۔ بیانیہ' امر کے مفہوم میں مستعمل ھوسکتا ہے مثلاً ''تم جاؤ گے اور سبق یاد کرو گے'' لیکن ''امر'' کسی اور فعل کے مفہوم میں استعمال نہیں ھوتا۔ ''امر'' کے ساتھ ساتھ حرکات و سکنات کا اظہار بھی ھوسکتا ہے اور چہرے کے تاثرات اور جذبات بھی۔ اور یہ ماقبل لسانی ذرائع ابلاغ و اظہار ہیں' اور ان سے ''امر'' کی قدامت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ دور کیوں جائیے' پالتو جانوروں کو حرکات و سکنات سے یا زبانی حکم دیجئے اور دیکھئے وہ کتنی جلدی تھوڑا بہت سمجھ لیتے ہیں۔ حرکات و سکنات کے ذریعہ حکم دینا' لسانی یا صرفی امر کے مترادف تو نہیں تا ھم ''ارادے'' کی وجہ سے لسانی امر سے اس کا تلازمہ ضرور ھوتا ہے۔

ان مباحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ زبان کا اولین روپ امری زبان (*Imperative Language*) کی خصوصیات سے متصف ہوگا۔ گویا ابتدائی زبان تفاعل کے اعتبار سے ''امر'' کی زبان رہی ہوگی اس زبان کی تشکیل جدید ممکن نہیں۔ زبان کی تاریخ میں کسی ایسے دور کا تعین بھی ممکن نہیں جس میں ''امر'' نے اتنا اہم کردار ادا کیا ہو۔ ''امر'' کی زبان، ایک مفروضہ ہی ہوسکتی ہے، اور اسے زبان کے قدیم ترین دور سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ ''امر'' کی زبان سے ایسی زبان مراد نہیں لی جانی چاہیئے جو صرف افعال پر مشتمل ہو اور افعال بھی صیغہ ''امر'' کے۔ اس سے مراد محض ایسی زبان ہے جو عموماً امر کے تفاعل تک محدود ہو۔

ندائیہ کا صیغہ بھی تفاعل کے لحاظ سے امر کے دائرے میں شامل کیاجاسکتا ہے۔ ندائیہ اور ''امر'' میں جذباتی متن، آواز کے اتار چڑھاؤ، لہجے اور تفاعل کے لحاظ، سے بڑی مماثلت ہوتی ہے۔ ''حامد!'' ''امی!'' ''ابا!'' جیسے ندائیے اور ''سنو'' ''آؤ''۔ ''جا''۔ ''چپ'' جیسے 'امر' پر غور کیجئے۔ کیا ان سے یکساں ارادوں، یکساں صورت حال، اشیاء مدرکہ اور قوت ارادی کے درمیان یکساں رشتوں کا اندازہ نہیں ہوتا؟۔

بعض زبانوں میں مادے سے تمنائی کے صیغے کی ترجمانی ہوتی ہے۔ ''طلب'' اور ''تمنا'' کے تلازمے کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمنائی کا صیغ بھی ''امر'' کی طرح قدیم ہوگا لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ نفسیاتی اعتبار سے ''تمنا'' میں امر کا شائبہ ہوتا ہے اور بچے کی جبلت اسے ''تمنا'' سے پہلے ''طلب'' پر آمادہ کرتی ہے، جس میں انکار کا شائبہ نہیں ہوتا۔ اس لئے تمنا ذہنی ارتقا کی بعد کی منزل میں بیدار ہوتی ہے۔ چناچہ تمنائی کے صیغے کو ''امر'' کی صیغے سے قدیم تر یا اس کا ''ہم عصر'' قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بعض موقعوں پر لہجہ بھی تمنائی کو تفاعل کے اعتبار سے امر بنادیتا ہے۔ غالباً اسی لئے **ڈے ویز** نے صیغہ تمنائی کو ''امر'' کی ضعیف شکل قرار دیا ہے۔

''امر''کی زبان آہستہ آہستہ ایسی صورت اختیار کرتی گئی کہ اس میں افعال کے دوسرے روپ اور دوسری صرفی شقیں ابھرتی اور کچھ عرصے سیال حالت میں رہ کر معین حیثیتیں اختیار کرتی گئیں۔ اور زبان کی وہ تاریخ شروع ہوئی جو عبارت ہے صوتی تبادل، صوتی انحراف تراش خراش، معنویات کی کروٹوں اور زبان کے تغیروتبدل کے عمومی قوانین سے۔

لِسانی ارتقائے مدارج

زبان کے آغاز سے متعلق مختلف نظریات کا جائزہ لے کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انسان کے اولین لسانیاتی ذرائع ابلاغ مختلف تجربوں کی منزلوں سے گزرتے اور متروک یا مقبول ہوتے رہے ہیں اور حسب ضرورت، شعوری یا غیر شعوری طور پر تغیرو تبدل، تراش خراش حک و اصلاح کا عمل کار فرمارہا ہے۔ ابلاغ کی ناکامی نے انھیں متروک یا قابل ترمیم ٹھہرایا اور کامیابی نے مقبول لیکن قبولیت کی سند پالینے والے ذرائع ابلاغ بھی جامد نہیں ہے۔ استدادزمانہ کے ساتھ ساتھ ان میں بھی بتدریج کوئی نہ کوئی تغیر، صوتی یا معنوی، ضرور ہوتا رہا اور وہ سیال حالت سے گزر کر معینہ صورت اختیار کرتے گئے۔ اس معینہ صورت نے صحیح معنوں میں اجزائے زبان کہلوایا۔

زبان ایک سماجی عمل ہے اور انسانی ارادے کا نتیجہ۔ انسان اپنی انفرادی اور سماجی ضرورت کے تحت اسے استعمال کرتا ہے، اس لئے وہ جامد نہیں رہ سکتی۔ بدلتے ہوئے حالات نئے نئے تقاضوں، ذہنی اور ثقافتی ارتقاء کے ساتھ ساتھ زبان میں تبدیلیاں بھی ناگزیر ہیں۔ یہ تبدیلیاں لسانی سرمائے میں اضافہ کرتی اور زبان کو ارتقا کی منزلیں طے کراتی ہیں۔ ہر زبان کی تاریخ عبارت ہے تغیرو تبدل سے۔ یہ تغیرو تبدل صوتی بھی رہا ہے اور معنویاتی بھی۔ صرفی بھی رہاہے اور نحوی بھی۔

بیسویں صدی کے اوائل تک ماہرین لسانیات نے لسانی ارتقا سے بحث کرتے ہوئے صوتی و معنویاتی، اور صرفی و نحوی تبدیلیوں سے متعلق بڑی موشکافیاں تو کی ہیں لیکن انھوں نے کلمے کو لسانی مفہوم کی بنیادی اکائی قرار دے کر کلمے کی صرفی حیثیت یا اس کی ساخت کو ہی زیادہ تر موضوع بحث بنایا ہے۔ بعض ماہرین لسانیات نے انسان کے ابتدائی کلموں کی سراغ رسی کی بھی کوشش کی ہے اور قیاس تمثیلی سے مفروضہ کلمات کی تشکیل جدید کرکے، ان کے مشتقات سے بھی بحث کی ہے۔ لسانی تاریخ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ ابتدائی کلمے کیا تھے اور کس طرح وجود میں آئے۔ ہاں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعض ماہرین نے انسانی نفسیات، بچوں کی زبان اور قدیم ترین زبانوں کے مطالعے سے کچھ ایسے بھی اندازے پیش کئے ہیں جو عین حقیقت نہ سہی لیکن قرین قیاس ہوسکتے ہیں اور ان کی کسی قدر سائنسی توجیہ ہو سکتی ہے۔ان ماہرین کی تحقیقاتی کاوشوں کے باوجود اس حقیقت کو نہیں جھٹلایا جاسکتا کہ سماجی نفسیات کے اصول، کلمے کے مقابلے پر جملے کے مقدم ہونے کی وکالت کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ زبان کی اولین اکائی یعنی جملے کے اجزائے ترکیبی خواہ وہ سیال حالت میں ہوں یا معینہ جامد نہیں رہے بلکہ ان میں تغیروتبدل ہوتا رہا۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ یہ تغیر غیرمحسوس ہوتا ہے۔ ایک ہی دور میں زبان کے بولنے والے یہ شعور رکھتے ہیں کہ وہ وہی زبان بول رہے ہیں۔ جس لسانی مواد میں سرمایۂ زبان میں ترمیم یا اضافہ کرنے والے ذرائع کار فرما ہوتے ہیں، انھیں زبان کے بولنے والے جامد ہی سمجھتے ہیں۔وہ جن تبدیلیوں کے مرتکب ہوتے ہیں وہ بیشتر غیر شعوری اور غیر ارادی ہوتی ہیں۔ ان کے لئے لفظ یا کلمے کی ایک ''چالو'' حیثیت اور قدرو قیمت ہوتی ہے۔ اور اگر زبان میں یہ اضافی استقلال نہ ہوتا تو اس میں ایسی پراگندگی ہوتی کہ وہ سماجی ابلاغ کے قابل ہی نہ ہوتی۔ اگر ہم کسی لفظ کے ماضی کی سراغ رسی کی

کوشش کریں تو اس کی تاریخ کی ہر کڑی اضافی طور پر ایک ایسے جامد لفظ کی ترجمانی کرےگی جس کا چلن کسی مخصوص دور میں رہ چکا ھے۔ تاریخی تفسیر اشتقاقی آئینہ داری اور تغیراتی آنکھ مچولیاں ان ادوار کے بولنے والوں کے اعترافات نہیں بلکہ ان ادوار کے گزر جانے کے بعد تاریخی مطالعہ کرنے والے کی تحقیقات کا کرشمہ ھی ہیں۔

جملے کو زبان کی بنیادی اکائی تسلیم کرنے کے باوجود، لسانی تغیرات سے بحث کرتے ھوئے، لفظ کی ساخت، اس کی صوتی، صوری اور معنوی تبدیلیوں سے بحث ناگزیر ھے۔ چناں چہ انیسویں صدی اور ابتدائی بیسویں صدی کے ماھرین لسانیات نے لسانی تغیرات سے متعلق جو تحقیقات پیش کی ہیں انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ھاں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان کی ھمنوائی میں کلمے کو زبان کا اقل تریں صوتی جزو قرار نہیں دیا جاسکتا کیوں کہ اب جدید ماھرین لسانیات نے یہ واضح کردیا ہے کہ اقل تریں صوتی جزو ''فونیم'' (***Phoneme***) ھے اور اقل تریں معنوی جزو ''مارفیم'' (***Marpheme***)۔

ابتدائی انیسویں صدی میں **فان ھمبولٹ** (***Von Humbolatt***) نے پہلی بار زبانوں کی صوریاتی تقسیم کے ذریعے لسانی ارتقا کے مختلف مدارج کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے چودہ سال پہلے **فریڈرک فان شلیگل** ۱۸۰۸ء میں اپنی تصنیف ***''Ueber die sprache und weisheit der Indier''*** میں زبانوں کی صوریاتی تقسیم پر اظہار خیال کرچکا تھا۔ لیکن اس نے لسانی ارتقا کے مدراج کی نشان دھی نہیں کی تھی بلکہ دنیا کی زبانوں کو دو گروھوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک سنسکرت اور اس کی مماثل زبانوں کا گروہ اور دوسرا بقیہ زبانوں کا۔ اول الذکر گروہ میں مادوں کی عضویاتی بالیدگی اور اندرونی تغیر کی صلاحیت کی نشان دھی کی ہے، جسے اس نے ''اشتقاق'' سے موسوم کیا ہے۔ دوسرے گروہ کے متعلق یہ بتایا ہے

کہ اس میں سابقوں اور لاحقوں سے مدد لی جاتی ہے۔ اس نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ بعض زبانوں میں سابقوں اور لاحقوں نے ''اشتقاق'' کی سی صورت پیدا کردی ہے۔ اس نے دوسرے گروہ میں نچلی سطح پر ''چینی زبان'' کو رکھا ہے اس طرح بالواسطہ سہ گروہی تقسیم کی راہ ہموار کردی۔ اس کے بھائی **اے ڈبلیو شلیگل** نے زبانوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے (۱) وہ زبانیں جن میں گرامر کی ساخت نہیں مثلاً چینی زبان جو غیر تغیر پذیر الفاظ پر مشتمل ہے اور یک لفظی یا تجریدی کہلا سکتی ہے (۲) وہ زبانیں جو لاحقوں (اور سابقوں) سے کام لیتی ہیں (۳) اشتقاقی زبانیں۔ لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ زبانیں یکے بعد دیگرے ان مدارج سے گزرتی ہیں۔ **فان همبولٹ** کی تقسیم السنہ کوئی اچھوتا کارنامہ تو نہیں لیکن اس نے اس تقسیم کے سلسلے میں زبان کے مختلف ارتقائی مدارج سے سرسری بحث کی ہے۔ اس نے ۱۸۲۲ میں اپنے رسالے موسوم بہ *''Ueber das Entsteken der grammatischen Formen und ihren Einfluss auf die Ideenen twickelung''* میں لسانی ارتقا کا یہ تصور پیش کیا ھے کہ ''شروع شروع میں زبان معروضی اشیاء ھی کی ترجمانی کرتی ہے۔ ان کے باھمی روابط کو سمجھنے یا ان کا اندازہ لگانے کا فرض سامع کے ذمے چھوڑ دیتی ھے۔ رفتہ رفتہ کلموں کی ترتیب معین ھوتی جاتی ہے۔ کچھ کلمے اپنے آزادانہ استعمال بلکہ اصلی اصوات سے بھی محروم ھوجاتے ہیں اور لسانی ارتقا کی دوسری منزل میں کلمرں کی ترتیب اور مادی اور رسمی دلالتوں کے درمیان ڈولتے ھوئے کلموں سے قواعدی روابط کا اظہار ھوتا ہے۔ بتدریج یہی لاحقے بن جاتے ہیں لیکن لاحقوں اور بنیادی کلموں کے درمیانی روابط استوار نہیں ھوپاتے۔ ان کے درمیانی جوڑ واضح ھوتے ہیں۔ اس طرح اصوات کا ایک مجموعہ سا بن جاتا ہے لیکن کوئی ایک اکائی نہیں بنتی۔ تیسری منزل میں ایک ھیئت ابھرنی شروع ھوتی ہے لیکن سیال حالت کی وجہ سے کوئی معین روپ اختیار نہیں کرتی۔ ارتقا کی

چوتھی منزل میں کلمہ ایک اکائی بن جاتا ہے اور لاحقے اشتقاقی اصوات کی حیثیت اختیار کرلیتے ہیں۔ ان اصوات کے ذریعے سے اس کے قواعدی روابط معین ہوجاتے ہیں۔ ہر کلمہ ایک معینہ صرفی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور تعمیری کلموں کی کوئی آزادانہ مادی حیثیت باقی نہیں رہتی بلکہ وہ محض قواعدی رشتوں کی علامت بن کر رہ جاتے ہیں۔ مثلاً لاطینی لفظ ''*amavil*'' اور یونانی ''*epoiesas*'' کم ترقی یافتہ زبانوں کے ایسے ہی ارکان اور تراکیب کے الفاظ کے مقابلے پر حقیقی معنوں میں قواعدی ہیئت کے حامل ہیں کیوں کہ ان میں اجزائے ترکیبی کے باهمی ادغام نے ایک مکمل صوتی اکائی کی حیثیت اختیار کرلی ہے اور ان اجزا کی علیحدہ حیثیت محسوس نہیں ہوتی۔ **همبولٹ** نے اس طرح یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اشتقاق (***Flection***) ارتباط (***agglutination***) سے ارتقا پاتا ہے۔' (بحوالہ ''زبان ماہیئت' ارتقا اور آغاز'' **از یسپرسن** (صفہ ۵۸)

همبولٹ نے اشتقاق اور امتزاجی ترکیب یا ارتباط کی اصطلاحوں کے ساتھ ساتھ ایک نئی اصطلاح ''انضمام'' (***Incorporation***) بھی استعمال کی ہے۔ اس نے انضمامی زبان کی مثال میں میکسیکو کی زبان ''میکسیکن'' کو پیش کیا ہے' جس میں شخصی اشارہ کرنے والے عنصر اور مادے کے درمیان فعلیہ ہیئت میں مفعول کو بھی شامل کردیا جاتا ہے **همبولٹ** رقم طراز ہے کہ ''چینی زبان کے علاوہ' جس کی کوئی قواعدی ہیئت نہیں ہوتی' زبانوں کی تین ہیئتیں ہوسکتی ہیں۔ اشتقاقی' امتزاجی یا ارتباطی اور انضمامی۔ لیکن تمام زبانوں میں ایک سے زیادہ ہیئتیں بھی ہوتی ہیں۔ کوئی زبان کلی طور پر امتزاجی یا اشتقاقی نہیں ہوتی کیوں کہ امتزاج اور اشتقاق عام طور پر خلط ملط ہوتے ہیں اشتقاق ہی کی بدولت کلمے کو اندرونی استحکام نصیب ہوتا ہے اور جملے کے اجزائے ترکیبی' ربط خیال کے مطابق ترتیب پاتے ہیں۔ اشتقاق کو لسانی ساخت کا بہترین اصول قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس اصول کی

کماحقہ' نگہداری کسی زبان میں نہیں ملتی تاہم سامی زبانوں میں اس کی نگہداری زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر نظر آتی ہے۔''

''بحوالہ'' یسپرسن

ہمبولٹ نے یہ رائے بھی ظاہر کی ہے کہ زبان اپنے بولنے والوں کی ذہنی قوت یا استعداد کی تبدیلیوں کے زیر اثر مسلسل ارتقا پذیر رہتی ہے۔ اس ارتقا کے دوران دو قطعی ادوار کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔ ایک وہ دور جس میں بول چال کی تخلیقی جبلت نمو پذیر اور فعال ہو۔ دوسرا وہ جس میں سکوت اور جمود شروع ہوتا ہے اور اس کے بعد تخلیقی جبلت میں مبینہ طور پر انحطاط ہونے لگتا ہے۔ انحطاطی دور میں زندگی کے نئے اصول اور زبان میں نئی کامیاب تبدیلیوں کا آغاز بھی ہوسکتا ہے۔ تخلیق ہیئت کے دور میں زبان کے بولنے والے اس کے مقصد پر اتنی توجہ نہیں دیتے جتنی خود زبان پر مرکوز کرتے ہیں۔ وہ خیالات کے اظہار کی کوشش کرتے ہیں اور کامیابی کا حوصلہ افزا احساس زبان کی تخلیقی قوت کو بڑھاتا ہے۔ دوسرے دور میں اشتقاقی ہیئتیں پامال ہوکر ختم ہونے لگتی ہیں۔ یہ صورت حال ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے پر پسماندہ زبانوں میں کم ملتی ہے۔ جب انسانی ذہن زیادہ فعال ہوتا ہے تو زبان میں شدید تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ اس طرح زبان حسیاتی سطح سے ذہنی سطح کی طرف سفر کرتی ہے۔ زبان کے ارتقائی سفر کا ایک رخ اور بھی ہوتا ہے۔ نسبتاً نا ہموار کھردرے یا غیر معمولی اعضائے نطق اور کم حساس کان اصول آہنگ سے ناشناسا ہوتے ہیں' اور ان کی وجہ سے زبان کے وہ اجزا جن کی مکمل تفہیم زیادہ ضروری نہیں ہوتی لاپروائی کا شکار ہوکر مختصر یا حذف ہوجاتے ہیں۔ محولہ بالا پہلے دور میں زبان کے عناصر بولنے والوں کے شعور میں ابھرتے رہتے ہیں اور یک قلم فراموش نہیں ہوتے اور ذہنی عمل کے وسیلے کو بہتر بنانے میں ایک طرح کا جمالیاتی حظ محسوس ہوتا ہے۔ لیکن دوسرے دور میں زبان زندگی کی عملی ضرورتوں اور تقاضوں ہی

کو پورا کرتی ہے۔ **ھمبولٹ** نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ انگریزی اور اس جیسی دوسری زبانیں مستقبل میں چینی کی ہیئت سے مشابہ ہوجائیں گی یعنی وہ اشتقاقی منزل سے تحلیلی منزل پر پہنچ چکی ہیں اور اس منزل پر منصرف کلمے انفرادی طور پر اکائیوں کی حیثیت اختیار کرچکے ہیں اس لئے قواعدی روابط کے اظہار کے لئے دوسرے کلمہ ن کا سہارا لینا ہوگا ا ر پھر ہیئت کے لحاظ سے ان زبانوں اور چینی زبان میں بڑی مماثلت ہوگی لیکن ان میں اشتقاق کے آثار تھوڑے بہت رہ جائیں گے''

''بحوالہ'' **یسپرسن**

۱۸۵۱ء میں **جیکب گرم** (*Jacob Grimm*) نے اپنے ایک مضمون ''زبان کا آغاز'' میں اپنا فلسفۂ لسان نہایت شاعرانہ انداز میں پیش کیا تھا۔ اس کا نقطۂ نظر درخور اعتنا تو نہیں۔تاہم اس نے زبان کے بالکل ابتدائی دور اور ارتقا سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے' ان کا سرسری جائزہ بے محل نہ ہوگا۔ **گرم** کے نزدیک انسانی زبان اپنے ابتدائی مرحلے میں صرف تین مصوتوں *a, i, u* پر مشتمل تھی اور آہستہ آہستہ کچھ مصمتے بھی وجود میں آگئے۔ ہر کلمہ زبان یک رکنی ہی تھا۔ تجریدی تصورات مفقود تھے۔ زبان کی تشکیل پر عورتوں کے اثرات کی وجہ سے پرانی زبانوں میں تذکیروتانیث کی تصریف بھی ہونے لگی۔ جنس کے امتیاز کے ذریعے سے اسم اور اس کے متعلقات کی وضاحت ہوتی گئی۔ شخص' تعداد' زمانہ اور طور فعل ظاہر کرنے والے لاحقے ضمائر اور معاون کلموں کے اضافے سے شروع ہوئے۔ شروع شروع میں یہ لاحقے مادوں سے ڈھیلے ڈھالے طور پر جڑے ہوئے تھے لیکن بتدریج یہ باہمی طور پر مربوط ہوگئے۔ کلموں کی تکرار سے زمانہ ماضی کا اظہار ہونے لگا۔ افعال، اسما پر مقدم ہیں۔ افعال ہی سے معروضی اشیاء کو موسوم کیا گیا مثلاً جرمن کلمہ ***hahn*** (مرغا) ایک فعل ***hanan*** کی یادگار ہے۔ **گرم** نے زبان کے ارتقا سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا

ہے، ان میں **ھمبولٹ** کی صدائے بازگشت ملتی ہے۔ وہ زبان کے ارتقا کے تین مراحل بتاتا ہے۔ پہلے مرحلے میں مادوں اور کلموں کی تخلیق اور نمو ہوتی ہے۔ دوسرے میں اشتقاق فروغ پاتا ہے۔ اور تیسرے میں فکری رجحان، اشتقاق کو غیر تشفی بخش سمجھ کر اسے متروک قرار دینے لگتا ہے۔ اس نے ان مراحل کو تمثیل کے طور پر ''برگ'' ''شگوفے'' اور ''بار'' بھی کہا ہے۔ اس کے اپنے الفاظ میں ''انسانی زبان کے حسن نے زبان کے ابتدا میں نہیں بلکہ درمیانی دور میں فروغ پایا ہے۔ اس کے زیادہ پکے پھل مستقبل ھی میں ھوں گے '' ... '' زبان اپنی ابتدائی ہیئت میں سریلی اور خوش آواز تھی لیکن اس میں پراگندگی تھی' درمیانی ہیئت میں زیادہ سے زیادہ شاعرانہ دم خم پیدا ہوگیا جبکہ ہمارے دور میں زبان اپنے حسن کے انحطاط کا ازالہ مجموعی آھنگ سے کرتی ھے اور نسبتاً حقیر تر ذرائع سے بھی موثر بنتی ھے۔'' **گرم** نے اکثر موقعوں پرزبان کے انحطاط کا تذکرہ بھی کیا ھے۔ اس کی یہ رائے ھے کہ ''جرمن زبان کے خاندان السنہ کی قدیم ترین زبانیں خوشگوار اور مکمل ہیئت کی حامل ہیں اور ان میں مادی اور روحانی عناصر خوش اسلوبی سے سموئے ھوئے ہیں لیکن انھی زبانوں کے بعد کے ارتقا کے دوران اشتقاق کی لطافتیں تباہ ھوگئیں۔ اور ان کی جگہ خارجی وسائل اور معاون کلموں نے لے لی۔ مجموعی طور پر زبان کی تاریخ یہ ظاھر کرتی ہے کہ زبان اکملیت کی سطح سے گرتی گئی''۔ انیسویں صدی کے تقریباً تمام ماھرین لسانیات نے زبان کے ارتقا سے متعلق کم و بیش یہی نقطۂ نظر پیش کیا ھے۔ **گرم** یہ بھی کہتا ھے کہ اشتقاقی ہیئت کے مٹنے کی تلافی ایسی چیزوں سے ھوجاتی ھے' جو اشتقاق کی ھم پلہ بلکہ اس سے بہتر ھوتی ہیں۔ لطف یہ ھے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کی تردید بھی اس طرح کر جاتا ہے کہ ''زبان کا انحطاط محض ظاھری ھوتا ہے اور وہ بھی بعض اعتبار سے لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو زبان ترقی کرتی ھے اور اس کی لاینفک قوت اور ذاتی استعداد مسلسل بڑھتی

رھتی ہے۔ اس نے انگریزی کی مثال پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس زبان نے تمام صوتی قوانین اوراشتقاق سےدامن چھڑا کر ایسی قوت اور استعداد پیدا کرلی ھے جس کی نظیر کسی اور زبان میں نہیں ملتی۔"

گرم نے صوتی تبادل کا جو قانون پیش کیا ھے اور اس کی جو توجیہ کی ہے وہ اپنی جگہ خاصی اہم ہے لیکن چوں کہ مدارج ارتقا پر اس سے کوئی روشنی نہیں پڑتی اس لئے اسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

جدید لسانیات کے بانیوں میں **فرانز بوپ** کو بڑی اھمیت دی جاتی ھے اس کی کتابیں "نظام گردان" (جس کا انگریزی ترجمہ "سنسکرت یونانی، لاطینی اور تیوتانی زبانوں کا تجزیاتی مقابلہ" کے نام سے ۱۸۲۰ء میں شائع ھوا تھا) اور "*Vergleichende grammatik*" تاریخ لسانیات میں کم و بیش سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اس نے اول الذکر کتاب میں قواعدی ھیئتوں کے سرچشموں کی سراغ رسی کی ہے یہ اور بات ھے کہ وہ ہر فعلیہ ہیئت کی تہ میں سنسکرت "آس" اور "بھو" کی نشان دھی کرتا ہےاور *Horne Tooke* کے مضمون "*Epeapteroenta*" (سنہ ۱۷۸٦ء) کی طرح یہ بتاتا ہے کہ وہ اختتامیے جواب فعل کے لاینفک اجزا نظر آتے ہیں، اپنی اصل کے اعتبار سے آزاد کلمے تھے وہ یونانی اور لاطینی کے بعض افعال کے اختتامیوں کی یہ توجیہ کرتا ہے کہ وہ سنسکرت مادے "آس" کی بدلی ہوئی شکل ہیں اور بہت سے اختتامیوں کی کلید سنسکرت مادے "بھو" کو بتاتا ھے آس نے غالباً **جیکب گرم** کے زیر اثر یہ رائے بھی ظاھر کی ہے کہ قدیم ترین زبانیں تین مصوتوں *a, i, u*, پر مشتمل تھیں اور سنسکرت "*a*" ان مصوتوں میں سب سے زیادہ قدیم ھے گویا زبان کا آغاز سنسکرت "*a*" سے ھوا ہے بعد میں "حنکی قانون" (*palatal law*) کی دریافت نے یہ ثابت کردیا کہ یونانی صوتی ثلیث، *a, e, o*, کے ذریعے ابتدائی زبان کی ترجمانی زیادہ ھوتی ھے

بوپ نے اپنی دوسری کتاب میں زبانوں کی تقسیم پیش کی ہے اس نے فریڈرک شلیگل کی دوگروھی تقسیم کی تردید کی ہے لیکن وہ

آریائی گرامر کے تمام مسائل و مباحث اور سنسکرت مادوں کے اندرونی تغیرات کی توجیہہ میکانکی وسائل سے کرتا ہے۔ یہ رجحان اس کی گروہ بندی کو **اے ڈبلیو شلیگل** کی سہ گروہی تقسیم کی سی شکل دے دیتا ہے اس نے زبانوں کو اس طرح تقسیم کیا ہے :-

(۱) وہ زبانیں جن کے باقاعدہ مادے نہیں ہیں اور جن میں کوئی نظم بھی نہیں، نہ ہی گرامر کا تعین مثلاً چینی جس میں گرامر کے رشتوں کا اندازہ کلمات کے محل استعمال سے ہوتا ہے۔

(۲) یک رکنی یا احادی المقاطع زبانیں جن میں ترکیبی اور تصریفی صلاحیت ہوتی ہے اور جن کے منصرفات کا دارو مدار بیشتر ضمیری اور فعلی مادوں کے ارتباط پر ہوتا ہے ہند یورپی زبانیں اور پہلے اور دوسرے گروہوں میں شامل نہ ہونے والی زبانیں اسی گروہ میں رکھی جاسکتی ہیں۔

(۳) ذوالمقاطع یا دو جزے یا دو رکنی، سہ حرفی مادوں والی زبانیں صرف سامی زبانیں اس گروہ میں شامل کی جاسکتی ہیں ان زبانوں میں منصرفات و مشتقات مادے اشتقاق و تصریف سے یا اندرونی مصوتے کی تبدیلی سے وجود میں آتے ہیں۔

بوپ نے اتصال یا ارتباط اور اشتقاق یا تصریف جیسی اصطلاحوں کو استعمال نہیں کیا ہے شاید اس لئے کہ اول الذکر اصطلاح غیر آریائی زبانوں کے لئے استعمال کی گئی تھی اور بوپ اتصالی یا ارتباطی اور اشتقاقی زبانوں کو الگ الگ گروہوں میں شمار نہیں کرتا موخرالذکر اصطلاح غالباً اس لئے استعمال نہیں کی کہ اس میں الہام تھا اور **فریڈرک شلیگل** نے یہ اصطلاح صرف اندرونی تغیر کے لئے استعمال کی تھی **شلیگل** کے نزدیک انگریزی *drink/drank/drunk* میں خالص اشتقاق ہے جبکہ جرمن *trink-e/trank/ge-trunk-en* میں خالص اشتقاق کے علاوہ لاحقی عناصر بھی ہیں ظاہر ہے کہ **شلیگل** نے اشتقاق کی جو تعریف کی ہے اس کی رو سے کوئی زبان (دسوائے سامی زبانوں کے)

کلیتاً اشتقاقی نہیں ہوسکتی اور اس کی بنیاد پر زبانوں کی گروہ بندی درست نہیں ہوسکتی **شلیگل** کے بعد کے ماہرین لسانیات نے اس اصطلاح کو اس محدود مفہوم میں استعمال نہیں کیا۔ انہوں نے یہ اصطلاح اشتقاق کی اندرونی اور بیرونی دونوں صورتوں کے لئے استعمال کی ہے، جن کی مثالیں سنسکرت اور یونانی وغیرہ میں عام ہیں

فریڈرک شلیگل، اے ڈبلیو شلیگل اور فرائز بوپ

تینوں نے یہ نہیں بتایا کہ ان کی گروہی تقسیم دنیا کی ہم عصر اور شانہ بہ شانہ پائی جانے والی زبانوں کی تقسیم ہے اور تاریخی ارتقا کی مختلف منزلوں کی نشان دہی کرتی ہے **بوپ** کی تقسیم السنہ اور گروہی وضاحت کی رو سے ایک زبان دوسری منزل سے تیسری منزل پر نہیں پہنچ سکتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس نے آریائی یا ہند یوروپی زبانوں کے اختتامیوں کی جو توجیہ کی ہے، اس سے ایک ہی زبان کی تینوں منزلوں یعنی انفرادی ارتباطی یا اتصالی اور اشتقاقی یا تصریفی کے نظریئے کے لئے راہ ہموار ہوجاتی ہے۔ اس نے ''تصریفی نظام'' میں یہ رائے بھی ظاہر کی ہے کہ زبانیں اپنے اس قدیم ترین زمانے میں جس کا ہمیں علم ہوسکا ہے، اپنی تکمیل کر کے روبہ انحطاط ہوچکی تھیں۔

اس نے **گرم** پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بھی قلم بند کیا ہے کہ زبانیں نحوی اعتبار سے ہر چند ترقی یافتہ ہوں، علمی گرامر کی ساخت کے لحاظ سے وہ اس مکمل ساخت کے اکثر اجزا کھو چکی ہیں، جس میں کلمے اپنے صحیح مقام پر اور صحیح باہمی رشتوں کے ساتھ استعمال ہوتے تھے اور ہر مشتق کا اس کے ماخذ سے تعلق صریحی ہوتا تھا۔ (بحوالہ یسپرسن)

کچھ سال بعد **آگسٹ فریڈرک پاٹ** **(August-F-Patt)** نے زبانوں کو چارگروں میں تقسیم کیا (۱) انفرادی (۲) ارتباطی یا تالیفی (۳) اشتقاقی (۴) انضمامی۔ اس کی یہ تقسیم **همبولٹ** کی صدائے باز گشت ہے۔ تاہم اس کا تذکرہ اس لئے ضروری تھا کہ اس نے اپنی تقسیم کے ذریعے سے لسانی ارتقا کی چار منزلوں کا ایک اشاریہ پیش کردیا ہے۔

آگسٹ شلیخر جسے کئی اعتبار سے تقابلی لسانیات کے دوراول کے انتہائی عروج کا نمائندہ اور دوراول اور دورجدید کی درمیانی کڑی قرار دیا جاتا ہے **ہیگل** (*Hegel*) کا معتقد تھا، اس لئے اس نے زبان کی گروہ بندی میں بھی تثلیث کو ملحوظ رکھا ہے۔ وہ **پاٹ** کی بتائی ہوئی دو منزلوں تالیفی اور انضمامی کو ملاکر ایک ظاہر کرتا ہے۔ اس کا یہ خیال ہے کہ زبان معانی یا مواد اور رشتے یا ہیئت پر مشتمل ہوتی ہے۔ وہ محض رشتے یا ہیئت کا اظہار نہیں کرتی۔ معانی اور ہیئت کے لحاظ سے اس کی حسب ذیل تین صورتیں ہوسکتی ہیں :-

(۱) پہلی صورت میں اصوات سے صرف معانی کا اظہار ہوتا ہے۔ محل کلمات سے ان کے باہمی رشتوں یا رابطوں کی طرف کنایہ ہوتا ہے۔ اس صورت میں زبانیں انفرادی (*Isolating*) ہوتی ہیں ۔

(۲) دوسری صورت میں اصوات کے ذریعے معانی اور باہمی رشتوں یا ہیئت دونوں کا اظہار ہوتا ہے لیکن تعمیری اجزا مادے میں اس طرح جڑے ہوتے ہیں کہ انہیں پہچانا جاسکتا ہے اور مادہ مستقل یا غیر تغیر پذیر ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں زبانیں تالیفی یا ترکیبی کہلاتی ہیں۔

(۳) تیسری صورت میں معانی اورباہمی رابطوں یا ہیئت کے عناصر ایک دوسرے میں مدغم ہو کر وحدت اختیار کرلیتے ہیں۔ مادے میں تبدیلیاں اندرونی بھی ہوسکتی ہیں اور بیرونی بھی یا سابقوں اور لاحقوں کے ذریعے بھی۔ ایسی حالت میں زبانیں اشتقاقی یا تصریفی کہلاتی ہیں۔

شلیخر ان حالتوں کی تمثیل کے لئے نیم ریاضیاتی فارمولا استعمال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر مادے کو K سے ظاہر کیا جائے اور سابقے اور لاحقے کو بالترتیب "P" اور "S" سے۔ اندرونی تبدیلی کو قوت نما X سے تعبیر کیا جائے تو انفرادی زبان میں "R" کے سوا کچھ اور نہ ہوگا اور جملے کی تعبیر R K R R سے کی جائے گی

گی تالیفی زبان میں ایک کلمے کا فارمولا PR'RS یا PRS ہوگا۔
تصریفی زبان کا کلمہ PR^x یا K^xS سے ظاہر کیا جائے گا۔

شلیخر کی یہ رائے ہے کہ یہ تینوں صورتیں ہمارے عہد کی زبانوں میں بیک وقت ملتی ہیں لیکن یہ تینوں لسانی ارتقا کی تین منزلوں کی نشان دھی کرتی ہیں۔ اشتقاقی یا تصریفی منزل کے بعد ارتقا کی کوئی اور منزل نہیں ہوتی۔ اشتقاق کے ذریعے رشتے کا رمزی اظہار زبان کا منتہائے کمال ہے۔ اور اسی منزل پر زبان اپنی غرض و غایت پوری کردیتی ہے۔ یہ غرض و غایت سوائے اس کے کچھ اور نہیں کہ خیال کی صحیح صوتی تصویر پیش کردی جائے۔ لیکن زبان تصریفی بننے سے پہلے بالالتزام انفرادی اور تالیفی دور سے گزرتی ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا تاریخی حقائق بھی اس نظریئے کا اثبات کرتے ہیں؟ کیا ہم کسی موجودہ اشتقاقی زبان کی خالص تالیفی اور انفرادی صورتوں کا پتہ لگا سکتے ہیں؟ **شلیخر** ان سوالات کا جواب نفی میں دیتا ہے۔ قدیم ترین لاطینی زبان اتنی اچھی تصریفی تھی جتنی کہ جدید رومانوی زبانیں ہیں۔ گویا ان زبانوں کا معلومہ قدیم ترین روپ یا ان کا سرچشمہ خود بھی تصریفی منزل کی نشان دھی کرتا ہے۔ پھر ان کی تالیفی صورت کیا ہوسکتی تھی؟ یا انفرادی منزل پر ان کے سرچشمے کا کیا روپ رہا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ **شلیخر** کے بیان میں تناقض ہے لیکن وہ اس تناقض کا جواز پیش کردیتا ہے۔ اور **ہیگل** کے یہ الفاظ دھراتا ہے کہ تاریخ کا آغاز اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک انسانی روح اپنی آزادی کا شعور پیدا نہیں کرتی۔ **شلیخر** کے نزدیک زبان کے مکمل ارتقا کے بعد ہی یہ شعور ممکن ہے۔ چنانچہ انسانی اعمال کے دو بالترتیب مدارج زبان اور تاریخ ہیں۔ چوں کہ تاریخ اور ادب کم و بیش ساتھ ساتھ وجود میں آئے اس لئے **شلیخر** نے یہ نتیجہ نکالا کہ جوں ہی ادب ظہور پذیر ہوتا ہے زبان اپنا ارتقا ختم کرچکی ہوتی ہے۔

گویا ادب کی تخلیق زبان کے ارتقا کے نقطۂ عروج سے شروع ہوتی ہے اس کے بعد زبان معین ہو کر رہ جاتی ہے اور بہ جائے مقصد ہونے کے ذہنی اعمال کا ذریعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ بقول **شلیخر** ہمیں کسی ایسی زندہ زبان سے دو چار ہونے کا موقع نہیں ملتا جو ارتقا پذیر ہو یا زیادہ مکمل ہو چکی ہو' جو زندہ زبان بھی نظر آئے گی انحطاط پذیر ہی ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں دور تاریخ میں تمام زبانیں زوال پذیر ہی ہوتی ہیں۔ لسانی تاریخ کا مطلب ہی زبانوں کا زوال ہے۔

شلیخر کی تقسیم السنہ سے یہ بھی استنباط کیا جانے لگا کہ مغربی یورپ کی جدید زبانیں قدیم تصریفی زبانوں کی مسخ شدہ اور انحطاط پذیر صورتیں ہیں۔ ماضی بعید کے دور زریں کا راگ الاپنے والوں کو یہی نتیجہ اخذ کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن ستم ظریفی سے یہ خیال بھی عام ہوگیا کہ تہذیبی ترقی اور زبان کا عروج لازم و ملزوم ہیں حالاں کہ کسی زبان کی گرامر کی ساخت کو زبان بولنے والوں کی تہذیب اور ان کے تمدن سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لتھونی زبان میں قدیم سنسکرت گرامر کا نظام کم و بیش جوں کا توں نظر آتا ہے۔ اس میں تصریف یا اشتقاق کی جو اصل صورتیں ملتی ہیں وہ کسی بھی جدید یوروپی زبان میں نہیں۔ گویا عام ماہرین کے نقطۂ نظر سے لتھونی' گرامر کے نظام یا لسانی اعتبار سے یورپ کی تمام زبانوں سے زیادہ ترقی یافتہ قرار دی جاسکتی ہے لیکن کیا ہم محض اس وجہ سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ لتھونی عوام کی ثقافت اس **شیکسپیئر** سے بہتر تھی جس کی زبان میں قدیم تصریف یا اشتقاق کے اکثر پہلو ختم ہوچکے ہیں؟

شلیخر کی گروہ بندی کی تبلیغ و اشاعت **میکس ملر** اور **وھٹنے** نے زیادہ کی ہے۔ **میکس ملر** نے اس کی سماجی توجیہ بھی کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ انفرادی زبانیں' انسان کے خاندانی دور کی پیداوار ہیں اور امتزاجی زبانیں خانہ بدوش دور کی جبکہ اشتقاقی زبانیں سیاسی دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس نے انفرادی' امتزاجی اور اشتقاقی

منزلوں کو لسانی ارتقا کی تین کڑیاں قرار دیا ہے۔ زبان اپنے ارتقا کی اولین منزل میں انفرادی یا تجریدی ہوتی ہے، جنھیں یک لفظی بھی کہا جاسکتا ہے اس منزل میں زبان کے الفاظ ایک ہی حیثیت کے ہوتے ہیں۔ کوئی لفظ کسی اور سے مشتق نہیں ہوتا اور نہ ہی اس سے مشتقات بن سکتے ہیں۔ الفاظ میں ترتیب کے اعتبار سے مفہوم بدل جاتے ہیں۔ مفہوم کا دارومدار لہجے یا سیاق و سباق پر ہوتا ہے۔ زمانہ اور فعلی حالتوں کا اظہار بھی با معنی الفاظ سے ہوتا ہے۔ چینی اور جنوب مشرق کی بعض زبانیں اسی منزل پر ہیں۔دوسری منزل میں زبان میں لفظوں کا امتزاج ہوتا ہے۔ الفاظ میں دوسرے الفاظ جوڑ دیئے جاتے ہیں لیکن ان سابقوں یا لاحقوں کی اپنی مستقل صورت برقرار رہتی ہے اور ان کے جوڑ الگ الگ کئے جاسکتے ہیں۔ ترکی زبان کو مثالاً پیش کیا جاسکتا ہے۔ تیسری منزل میں الفاظ اور جوڑے ہوئے الفاظ جو گھس گھسا کر علامت رہ جاتے ہیں، اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ انھیں الگ الگ نہیں کیا جاسکتا۔ کبھی لفظ میں اندرونی تبدیلیاں ہوتی ہیں اور اس کی ہیئت بدلی جاتی ہے۔ آریائی یا ہندیورپی اور سامی زبانیں ارتقا کی اسی منزل میں ہیں ۔ **ڈاکٹر شوکت** سبزواری مرحوم نے **بیمنر** اور **وھٹنے** کے حوالے سے یہ چند مثالیں پیش کی ہیں :

''سنسکرت میں ''اسمی'' کے معنی ہیں ''میں ہوں''۔ یہ دو لفظوں یا ایک لفظ اور ایک حرف سے بنا ہے۔ ''اس'' (ہوں) اور ''می'' (میں) ہر چند ''اس'' اپنی اصلی شکل میں ہے لیکن ''می'' صورت بدل چکا ہے یہ اپنی اس صورت میں تنہا مستعمل نہیں۔ یونانی میں یہ فقرہ ''ای می'' ہے۔ اس میں دونوں لفظوں کی شکل بدل گئی ہے۔ ''ای'' (ہونا) جو سنسکرت ''اس'' کی بدلی ہوئی صورت ہے اب یونانی میں مستعمل نہیں۔ ''می'' کا استعمال بھی فعل سے الگ نہیں دیکھا گیا۔ لاطینی میں اس فقرے کی شکل بالکل بدلی ہوئی ہے۔ ''سم'' (میں ہوں)، اس میں ''اس'' کا ''س'' اور ''می'' کا ''م'' رہ گیا ہے۔ انگریزی ''am'' کا

حال بھی یہی ہے - "m" تو "می" کا مخفف ہے اور "a" سنسکرت "اس" سے ترش ترشا کر وجود میں آیا ہے - یہ دونوں اپنی موجودہ صورت میں تنہا انگریزی میں مستعمل نہیں (۱) "عربی 'ان' (ہر گز نہیں) "لا" اور 'ان' سے مرکب ہے - دونوں لفظوں نے میل میلاپ کے لئے اپنا اپنا چولا بدل دیا ہے - 'لا' نے اپنا آخری حرف یعنی 'الف' اور "ان" نے شروع کا حرف اس تال میل کی نذر کر دیا - تنہا "ل" اور "ن" عربی میں دیکھے نہیں گئے - 'فعلت' (تو نے کیا) اور 'تفعل' (تو کرتا ہے) 'فعل' اور 'انت' مرکب ہیں (فعل + انت = فعلت ــ انت = فعل + تفعل) - ان دونوں فعلوں میں 'فعل' تو صرف الٹا بدلا کہ ماضی میں ترکیب کے بعد اسکے آخر کا 'زبر' جاتا رہا اور مضارع میں یہ "پیش" سے بدل گیا' مگر 'انت' کٹ کٹا کر بالکل لنڈورا ہو گیا - یہ کرشمے تصریف کے ہیں، جو تمام متصرفہ زبانوں میں بھان متی کا سا کھیل دکھاتی ہے" - (۲)

وہٹنے نے مادے کو لسانی ارتقا کی بنیاد قرار دیا ہے اور یہ بتایا ہے - کہ ہند یوروپی زبان اپنے ارتقا کی پہلی منزل میں انفرادی رہی ہے - سیدھے سادے مادوں سے اشاریہ اور فعلیہ مادے وجود میں آئے اور ان کی باہمی ترکیب سے

(۱) اردو زبان کا ارتقا - ڈاکٹر شوکت سبزواری صفحہ ۷

(۲) " " صفحہ ۸

کثیرالمقاطع (Polysyllabic) کلمے پیدا ہوئے ۔ مثلاً فعلیہ
مادے "Vak" (بولنا) میں اشاریہ عناصر "می" "می"
"تی" (جن کی ابتدائی صورت "ما" "سا" "تا"
رہی ہوگی) کی ترکیب سے Vakmi (یہاں میں بولتا ہوں) ۔
"واکسی" (وہاں تو بولتا ہے) "واکتی" (وہ بولتا
ہے) جیسے مرکبات یا فقرے بنے ہونگے ۔ اسی طرح دوسرے
اشاریہ عناصر سے فاعل کی تعداد کا اظہار شروع ہوا ہوگا ۔
پھر "جنس" کے تعین کیلئے کچھ عناصر سے کام لیا گیا
ہوگا ۔ ابتدا میں زبان کا ہر کلمہ فعل رہا ہوگا یا اسم ۔ ان
ان کی ترکیب سے زبان ارتقا کی دوسری منزل پر پہنچ جاتی ہے ۔
سابقوں اور لاحقوں کے ادغام سے تیسری منزل کا آغاز ہوتا ہے ۔
لیکن اشتقاقی دور میں لاحقے یا تعمیری کلمے بنیادی کلموں
میں اسطرح گھل مل جاتے ہیں کہ انکی اصلیت کو بھول کر
وضاحت کیلئے مزید تعمیری کلموں کی ضرورت محسوس ہوتی
ہے اور زبان میں تحلیلی رحجان پیدا ہوتا ہے لیکن تحلیلی رحجان
کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ زبان میں اشتقاق کی صلاحیت نہیں
رہی اس میں (اشتقاق اور تحلیلی رحجان دونوں کی نشان دہی
کی جا سکتی ہے ۔

ہنری سویٹ (Henry Sweat) نے اپنی کتاب
"ہسٹری آف لینگویج" میں زبان کے ارتقائی منازل سے بحث
کرتے ہوئے ارتقا کی چوتھی منزل کا ذکر بھی کیا ہے ، جس
کا اشارہ **وھٹنے** کے یہاں بھی ملتا ہے ۔ شوکت سبزواری نے
سویٹ کے حوالے سے اس چوتھی منزل کی کیفیت یوں بیان
کی ہے :

تصریفی دور میں الفاظ اتنے گھل مل جاتے ہیں کہ اصل لفظ یعنی مادے اور اشتقاقی علامت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اسلئے کچھ عرصے کے بعد بولنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ لفظ دو یا دو سے زیادہ لفظوں سے بنا ہے۔ وہ اس مرکب کو بسیط سمجھ کر کوئی اشتقاقی علامت بطور سابقہ یا لاحقہ اس میں جوڑ دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ علامت کلمے سے الگ ہوتی ہے اور واضح طور پر اس سے الگ نظر آتی ہے۔ انگریزی فعل حال goes یا goeth مرکب ہے go اور s یا th (وہ) سے۔ لیکن اب انگریزی بولنے والے عوام اس فعل کو بسیط سمجھتے ہیں اور "وہ" کا مفہوم ادا کرنے کیلئے اسکے شروع میں "He" بڑھا کر He goes کہتے ہیں (حالانکہ صرف goes کہنے سے مفہوم ادا ہو سکتا ہے)۔ اس میں دو کلمے ہیں' دونوں مستقل ہیں اور دونوں جدا جدا مفہوم ادا کر رہے ہیں"— "سنسکرت میں مادے کے آخر میں "سی" بڑھا دیا جاتا ہے مثلاً "دا" (دینا) سے "داسی" "داسیتی" (وہ دے گا)۔ یہ فعل بہت کچھ تبدیلیوں کے بعد اردو میں "دے" ہوا۔ **ڈاکٹر بھنڈارکر** نے ان تبدیلیوں کی مختلف کڑیاں یہ بتائی ہیں۔

داسیتی۔ داسدی۔ داسئی۔ دائئی۔ دائی اور دے۔ اب "دے" میں کوئی حرف یا علامت اشتقاق نہیں جس سے زمانہ استقبال سمجھا جا سکے۔ اسلئے اردو بولنے والا "گا" علامت استقبال بڑھا کر "دے گا" کہتے ہیں۔ "دے گا" دو کلموں سے مرکب ہے۔ (دے + گا) اور

(۱)

دونوں اپنی جگہ مستقل اور آزاد ہیں" —

(۱) "اردو زبان کا ارتقا" ڈاکٹر شوکت سبزواری صفحہ ۹

جن ماہرین لسانیات کے حوالے سطور بالا میں دیئے گئے ہیں، انہوں نے بنیادی طور پر ہند یوروپی خاندان السنہ، اور ان کے ابتدائی سر چشمے کی مفروضہ صوریاتی تشکیل ہی سے بحث کی ہے اور صوریاتی و تقابلی مطالعے سے یہ استنباط کیا ہے کہ ابتدائی ہند یوروپی تجریدی یا یک لفظی تھی، اس کے بعد اس میں کلموں کے ارتباط اور اتصال سے ارتباطی یا ترکیبی صورت پیدا ہوئی اور پھر مرکبات نے ایسی صوتی اکائی کی حیثیت حاصل کر لی کہ ان میں تمیز دشوار ہو گئی، اسطرح اشتقاقی یا تصریفی صورت وجود میں آئی۔ انہوں نے ابتدائی ہند یوروپی کی تجریدی صورت کی مثال تو پیش نہیں کی لیکن چینی کی مثال پیش کرکے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ جب چینی کی تجریدی یا یک لفظی حیثیت انتہائی قدیم ثابت ہوتی ہے تو ابتدائی ہند یوروپی کی تجریدی حیثیت کا مفروضہ کیوں درست نہیں ہو سکتا جبکہ ماضی کی صوریاتی تشکیل کی سراغ رسی بھی اسی نتیجے پر پہنچاتی ہے۔ یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ماہرین نے بالواسطہ یہ اشارہ بھی کیا ہے کہ ان کے مستنبط نتائج کا اطلاق عام انسانی زبان پر بھی کیا جا سکتا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی زبان کو ارتقا کے تین واضح ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے دور کا آغاز بے ہیئت مادوں (formless roots) سے ہوا۔ پھر زبان ارتباطی یا ترکیبی دور سے گزری۔ اس دور میں تعمیری کلمے ظہور پذیر ہوئے۔ یہ کلمے اور مادے ابھی اپنی جگہ آزاد تھے، تیسرے دور میں تعمیری کلمے مادوں میں اس طرح سرایت کر گئے کہ ان کے اجزائے لاینفک بن گئے اور ناقابل تقسیم اکائیوں کی صورت پیدا ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان ماہرین کی رائے میں زبان کا آغاز

سیدھے سادے بے ہئیت مادوں سے ہوا۔ **بوپ** نے ان کی ماہئیت بھی متعین کی ہے ہم پچھلے باب میں **بوپ** کے حوالے سے یہ بتا چکے ہیں کہ اس نے سنسکرت قواعد دانوں سے مادے کا تصور لیا ہے اور ان کی تقلید میں مادوں کو یک رکنی قرار دیا ہے۔ **بوپ** کے مقلدین نے مفروضہ مادوں کو اوربھی صوتی خصوصیات سے متصف کر دیا ہے۔ مثلاً **کرٹی اس** نے یہ کہا ہے کہ ان میں ہمیشہ ایک قصیر مصوتہ بھی ہوتا تھا۔ **ووڈ** (wood) نے اپنے مضمون " ہند یوروپی مادوں کی تشکیل " (مطبوعہ جرنل آف جرمن فلالوجی 1.291) میں یہ رائے ظاہر کی کہ " میں ان لوگوں کی صف میں ہوں جن کا عقیدہ ہے کہ ہند یوروپی مادے یک رکنی تھے اکثر صورتوں میں ان مادوں کا آغاز مصوتے سے ہوا۔ یقیناً مصوتے ہی انسان کے ابتدائی منطوقات تھے - اگرچہ ہم ہند یوروپی کے آغاز کو نطق انسانی کا آغاز تو نہیں کہ سکتے تاہم ہم یہ ضرور فرض کر سکتے ہیں کہ زبان اپنے عہد آغاز میں بالکل قدیم ترین بھدی حالت میں تھی" — **کرٹی اس** اور **ووڈ** دونوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ابتدائی مادوں کی تعداد زیادہ نہ تھی - **وھٹنے** کے نزدیک " زبان کا آغاز ہی مادوں سے ہوا ہے۔ اور یہ حقیقت ہند یوروپی خاندان السنہ کی مختلف زبانوں کے دستاویزی حقائق کے محتاط استقرا کا نتیجہ ہے۔ مادوں کے نظریئے کی بنیاد اس منطقی ضرورت پر استوار ہے جو قواعدی عناصر کے تاریخی ارتقا کے نظریئے سے مستنبط ہے۔" ایک ذریعہ کا آغاز بھدا اور سادہ ہی ہو سکتا ہے۔ مثلاً زبان میں نام نہاد مادے — جو اظہار کے نا مکمل اشارے ہی رہے ہونگے"۔ **کرٹی اس**

مادوں کو حقیقی اور آزاد کلمے قرار دیتا ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی ایسی زبان کا وجود ممکن ہے جس میں صرف مادے ہی ہوں۔ اس سوال کا جواب اثبات میں دیا جاتا رہا ہے اور چینی زبان کی مثال پیش کی جاتی رہی ہے۔ (۱)

اس میں شک نہیں کہ چینی زبان ساخت کے لحاظ سے یک لفظی یا تجریدی ہے، اس کا ہر لفظ یک رکنی ہے، جسکے آہنگ اور لہجے کے تغیر سے معنی میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ صرفی اعتبار سے الفاظ میں کوئی تمیز نہیں کی جا سکتی مثلاً لفظ "تا" موقع محل کے لحاظ سے بڑا - زیادہ - بڑائی۔ بڑھانا وغیرہ کے معنی دیتا ہے گویا صفت بھی ہو سکتا ہے، اسم کیفیت بھی اور فعل بھی - قواعدی روابط مثلاً تعداد شخص، جنس، زمانہ حالت وغیرہ کا اظہار کسی قسم کے تعمیری کلمے یا اختتامیہ سے نہیں ہوتا - اگر کسی چیز کو جمع کے صیغے میں ظاہر کرنا مقصود ہو تو "اسم" میں کوئی لاحقہ نہیں بڑھایا جاتا بلکہ سیاق و سباق سے "جمع" کا صیغہ مراد لیا جاتا ہے - لیکن اگر کسی غلط فہمی کا امکان ہو یا جمع کے صیغے پر بطور خاص تاکید مقصود ہو تو علیحدہ الفاظ مثلاً "کی" (کچھ) "سو" (تعداد) وغیرہ کا اضافہ کر لیا جاتا ہے - چینی زبان کی گرامر کا اہم ترین حصہ، ترتیب الفاظ ہے - ترتیب کی تبدیلی سے جملے کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ مثلاً "تا کواک" کا مطلب ہے "بڑی ریاست یا ریاستیں" لیکن "کواک تا" سے مراد لیا جاتا ہے "ریاست بڑی ہے" چینی زبان، کے

---

(۱) "زبان اس کی ماہئیت، ارتقا اور آغاز" یسپرسن ۶۸-۳۶۷

قواعدان الفاظ کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں (۱) مکمل الفاظ (۲) خالی الفاظ (Empty words) خالی الفاظ قواعدی مقصد پورا کرتے ہیں ۔ مثلاً لفظ ''چی'' دوسرے تفاعل کے ساتھ ساتھ اضافت کا اظہار بھی کرتا ہے ۔ الفاظ ''من'' (لوگ) ''لک'' (طاقت) کو اس طرح ترتیب دیا جائے ''من لک'' تو مفہوم ہوگا کہ ''لوگوں کی طاقت'' لیکن یہی مفہوم زیادہ وضاحت سے یوں ادا کیا جاتا ہے ''من چی لک'' ''لوگوں کی طاقت'' یہی لفظ ''چی'' کسی جملے میں فاعل کے بعد استعمال کیا جائے تو وہ فاعل کو مضاف بنادے گا اور جملے کو ذیلی فقرہ بنادے گا ۔ مثلا ''وانگ پاؤ من'' (بادشاہ لوگوں کی حفاظت کرتا ہے) کو اس طرح کہا جائے کہ ''وانگ چی پاؤ من'' (بادشاہ کا لوگوں کی حفاظت کرنا) تو جملہ مکمل جملہ نہ رہے گا ۔ ''وانگ پاؤ چی من'' کا مطلب ہوگا ''بادشاہ کے حفاظت کردہ لوگ'' الفاظ کے قرینوں سے فاعل فعل اور مفعول کی ترتیب متعین ہو جاتی ہے اور اس ترتیب کی تبدیلی سے متعدی اور لازم جملے بنتے ہیں کسی لفظ کے ما قبل ''ے'' اور ما بعد ''کو'' استعمال ہو تو ''سبب سے'' کا مفہوم پیدا ہوتا ہے ۔ (1) اکثر ماہرین کا یہ خیال کہ چینی زبان اپنی ساخت کے لحاظ سے بالکل نہیں بدلی' درست نہیں ۱۸۶۱ء میں آر ۔ لیپسی اس (R. Lepsius) نے چینی اور تبتی زبانوں کے تقابل کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ''چینی زبان کی یک رکنی خصوصیت'' بعد کی پیداوار ہے شروع شروع میں یہ زبان کثیرالمقاطع (Polysyllabic) رہی ہے ۔ تلفظ اور لہجہ مرورایام کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے

---

(۱) ''زبان ۔ اس کی ماہیئت' ارتقا اور آغاز'' ۔ یسپرسن ۳۶۸-۳۶۷

(۲) زبان ۔ ماہیئت' ارتقا اور آغاز ۳۷۵

اور تبدیلی کا رخ تسہیلی رہا ہے - مصمتی خوشے آسان تر ہوتے گئے ہیں - (۱)

Ernst Kuhn نے ۱۸۸۳ء میں چینی، تبتی، برمی اور سیامی زبانوں کا تقابل کر کے یہ بتایا ہے کہ یہ سب تجریدی یا انفرادی زبانیں ہیں جن میں کسی قسم کا اشتقاق کار فرما نہیں، الفاظ کی ترتیب ھی قواعدی ذریعہ ہے - لیکن ان زبانوں میں ترتیب الفاظ کے قاعدے مختلف ہیں - ان میں سے کسی ایک کی ترتیب الفاظ کو اولین یا ابتدائی قرار دے کر باقی زبانوں کی ترتیب الفاظ کو اس سے ماخوذ یا ارتقا یافتہ کہنا درست نہیں - اختلافات کی توجیہ یہ کی جا سکتی ھے کہ ان کے مشترک سرچشمے کی ترتیب الفاظ میں تبدیلی ھوتی رھی اور وقت کے ساتھ ساتھ ان مختلف زبانوں میں ترتیب الفاظ کے مختلف قاعدے ابھر آئے - اگر اس لسانی سرچشمے میں الفاظ کی ترتیب آزادانہ تھی تو زبان کو با معنی بنانے کے لئے یہ مفروضہ ناگزیر ہے کہ اس میں کچھ نہ کچھ قواعدی وسائل ضرور ھوں گے جن کے کچھ نہ کچھ باقیات الصالحات موجودہ لسانی شاخوں میں نظر آتے ہیں - چینی زبان میں الفاظ کی ترتیب آغاز زبان ھی سے متعین ھو کر مستقل نہیں ھو گئی ہے - اس کی مخصوص قواعدی خصوصیات ایک طویل ارتقا کا نتیجہ ہیں - اور قواعدی رشتے ظاھر کرنے والے تعمیری کلمے آہستہ آہستہ متروک ھوتے گئے - ایک ماھر لسانیات **برن ھارڈ کارل گرین** (Bern hard Karl gren) نے چینی اصوات اور قدیم تلفظ کی تشکیل جدید سے بحث کرتے ھوئے یہ بتایا ہے کہ کلاسیکی چینی میں ضمیر متکلم کے لئے چار کلمے استعمال ھوتے تھے - عام طور پر انہیں مترادفات قرار دیا جاتا ھے لیکن ان میں سے دو جو بول

(۱) ''زبان'' - ماھئیت، ارتقا اور آغاز یسپرسن ۳۷۰

چال میں زیادہ استعمال ہوتے ہیں' ۔و مختلف حالتوں کا اظہار کرتے ہیں ایک فاعلی حالت کے لئے استعمال ہوتا ہے دوسرا مفعولی حالت کے لئے **کارل گرین** نے فاعلی اور مفعولی حالت کی تصریف کی مثالیں بھی پیش کی ہیں - (۱)

مختصراً یہ کہا جاتا ہے کہ چینی زبان کی ساخت اور اس کی تاریخ سے اس مفروضے کی تائید نہیں ہوتی کہ ہند یوروپی یا انسانی زبان کا آغاز یک رکنی مادوں سے ہوا تھا - اس سے قطع نظر ''مادے'' کا تصور بھی غور طلب ہے - یورپ کے ماہرین لسانیات نے سنسکرت قواعدانوں کے زیر اثر ''مادے'' کے نظریے کی تبلیغ ہی نہیں کی بلکہ ان کی تقلید میں مادوں کو فعلی خصوصیت کا حامل بھی قرار دیا - ظاہر ہے کہ فعلی خصوصیت میں ''تجریدی پہلو'' غالب نظر آتا ہے - یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ابتدائی ناطق انسان میں ''تجرید'' کی صلاحیت کیسے پیدا ہو گئی اور وہ تجریدی الفاظ کے بل بوتے اظہار وابلاغ کا حق کیسے ادا کرتا ہوگا - اگرچہ چینی تجریدی یا یک لفظی زبان ہے لیکن اس میں مادی اشیا کے لئے بھی بہت سے الفاظ ہیں ' اگر یہ الفاظ بھی مادے سمجھ لئے جائیں تو ان میں فعلی خصوصیت کیوں کر پیدا کی جا سکتی ہے ! عام خیال یہ بھی رہا ہے کہ مادوں کا ایک مخصوص دور تھا جب کہ تمام مادے وجود میں آئے اس کے بعد مادوں کی تخلیق بند ہو گئی - لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام زبانوں میں نئے نئے الفاظ تشکیل پاتے رہے ہیں اگر وہ مشتق الفاظ کی اساس بنتے ہیں تو انہیں نئے مادے کیوں نہ کہا

---

(۱) ''زبان - ماہیت' ارتقا اور آغاز یسپرسن ص۔ ۳٦۹

جائے - بہت سے الفاظ نام نہاد مادوں سے نہیں بلکہ مستقل الفاظ سے بنے ہیں اور وہ الفاظ خود بھی مشتقات ہوتے ہیں - بعض الفاظ کی جزوی صوتی مماثلت سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک مادے سے بنے ہیں مثلاً انگریزی الفاظ Sorrow اور Sorry جن میں صوتی اعتبار سے Sorr مشترک ہے اور جسے غلطی سے مادہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے - لیکن ان کا ایک دوسرے سے دور کا تعلق بھی نہیں - ایک قدیم انگریزی لفظ "Surig" (زخمی) کی ارتقا یافتہ صورت ہے اور دوسرا "Sorry" بمعنی "توجہ" کی معنوی تبدیلی کا نتیجہ - مختلف زبانوں میں جتنے بھی مادے ہیں وہ مختلف اوقات اور مختلف ادوار میں جنم پاتے رہے ہیں - کبھی زیادہ کبھی کم - انہیں کسی ایک مخصوص دور تک محدود کر دینا درست نہیں - مادے کی ماہیئت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مادہ، کچھ کلموں کا وہ مشترک صوتی جزو ہے جسے بولنے والے اشتقاقی اعتبار سے مشترک سمجھ لیں - بعض موقعوں پر یہ مشترک صوتی جزو، ایک مستقل کلمہ بھی ہو سکتا ہے مثلاً 'پاس' اور 'پار' میں 'پا' یا Barter اور Barber میں 'بار' مادے ہیں اور مستقل کلمے کے طور پر مستعمل ہوتے ہیں کبھی مشترک عنصر یا عناصر کا تلفظ دشوار بھی ہوتا ہے مثلاً drank 'drink 'drunk یا Sit 'Sat Sat وغیرہ میں - give اور gift میں "gi" مشترک ہے اور Speak اور Speech میں "Spee" لیکن یہ مستقل کلمے نہیں - مادے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی ماہیئت کا بیان یا تلفظ ہمیشہ آسان نہیں ہوتا اور معنی بھی مبہم اور غیر متعین ہی ہوں گے - ظاہر ہے کہ جو صوتی جزو زیادہ سے زیادہ مدرکات، میں مشترک ہوگا وہ عمومی اور تجریدی ہی ہو سکتا ہے - چونکہ

فعلی تصورات (Verbal Concepts) جامد اشیا کے تصورات کے مقابلے ہر زیادہ عمومی اور تجریدی ہوتے ہیں، اس لئے مادوں کو "فعلی تصورات" ہی سے مختص کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن مندرجہ بالا مفہوم میں مادوں کا وجود ہر دور میں ہو سکتا ہے اور انہیں کسی ایک مخصوص دور کی تنگنا میں محدود نہیں کیا جاسکتا ۔ اس لئے یہ قیاس کہ انسانی زبان کا اولین دور مادوں کا دور تھا ، درست نہیں ۔

ترکیبی زبان کے نظرئیے کی صداقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ زبان میں ترکیبی ہیئت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ایک مادے کے بعد بولا جانے والا دوسرا مادہ یا کلمہ پہلے کا جزو ترکیبی محسوس ہونے لگے ۔ عام طور پر ماہرین لسانیات نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جوڑے جانے والے مادے رفتہ رفتہ اپنی آزادانہ حیثیت کھوتے گئے اور گھس گھسا کر ایسی صورت اختیار کر گئے کہ ان کے اصل معنی بھلا دئیے گئے اور ان کی حیثیت محض علامات اشتقاق کی رہ گئی ۔ وھٹنی نے تو یہ رائے ظاہر کی ہے کہ زبان کی کثیرالمقاطع حیثیت کا آغاز اس وقت ہوا جب اسمیہ اور فعلیہ مادوں کو باہم ترکیب دیا جانے لگا ۔ مثلاً فعلیہ مادے "Vak" (بولنا) میں اسمیہ مادوں mi' 'ti 'si کا (جن کی ابتدائی صورت ta 'sa 'ma تھی اور جن سے ضمیر شخصی متکلم، حاضر، غائب اور اشارہ قریب وبعید کا اظہار ہوتا تھا) اضافہ کیا گیا تو "Vakmi" (میں یہاں بولتا ہوں) - "Vaksi"، "Vakti" (تو وھاں بولتا ہے) "وہ وھاں بولتا ہے) وغیرہ مرکبات وجود میں آئے ۔ اس میں شک نہیں کہ مادوں کے یکے بعد دیگرے بولے جانے سے بھی نئی نئی ترکیبیں وضع ہوتی

رہیں لیکن زبان کی ترکیبی ہیئت کو ترکیب کی اسی نوعیت
تک محدود کر دینا درست نہیں ۔ مادوں اور کلموں کی باھمی
ترکیب کا عمل بھی ھوتا رھا ھے ۔ اس سے قطع نظر یہ سوالات
بھی ابھرتے ہیں کہ جب کلموں کے اختلاط کا عمل کسی وقت
بھی ھو سکتا ھے تو ایسی صورت میں زبان کا کوئی مخصوص
ترکیبی دور متعین کیا جا سکتا ہے ؟ کیا آج کی اشتقاقی زبانوں
کے پچھلے ترکیبی دور کا حتمی تعین ھو سکتا ہے ؟ وہ ترکیبی
اجزا جو تعمیری کلموں یا لاحقوں کی حیثیت اختیار کر گئے ' اصلاً
مادے تھے یا آزاد اور حقیقی کلمے ؟ کیا تعمیری کلموں یا لاحقوں
کے وجود میں آنے کی یہی ایک صورت ممکن ہے جو ترکیبی نظریہ
پیش کرتا ھے ؟ مادوں اور کلموں کے جوڑ کی حیثیت اس سے
زیادہ اور کچھ نہیں کہ وہ علی الترتیب بولے جاتے ہیں اور ان میں
سے بعض میں صوتی حذف و سقوط یا تغیر و تبدل کی وجہ سے صوری
تبدیلی ھو جاتی ہے ان کے اختلاط کی مختلف صورتیں ھو سکتی
ہیں ۔ مثلاً ترکی مرکب "شیشہ لر" (شیشہ + لر = بوتلیں) شیشہ
لر مز (شیشہ + لر + مز = ھماری بوتلیں) ۔ "بازدی دیدی"
(یاز + دی + دیدی = اس نے لکھا تھا) ۔ یا اردو مرکبات ہتھچھٹ
کھٹمل (کھاٹ + مل) بچپن ۔ بڑھاپا ۔ بھڑاس ۔ لٹس ۔ مہاسا
(منھہ + واسک) وغیرہ میں اختلاط کی نوعیتیں بالکل مختلف ہیں۔
ایک ھی لسانی دور میں بیک وقت تمام نوعیتیں بھی ملتی ہیں ۔
یسپرسن نے انگریزی کے ایک مرکب "untruthfully" کی
مثال پیش کی ھے ۔ اور یوں تجزیہ کیا ہے ۔ un-tru-th-ful-ly
میں سے صرف ایک تعمیری کلمہ ful (l) ھی ایسا ھی جواب بھی
آزاد اور با معنی حیثیت سے استعمال ھوتا ہے ۔ "hand full of"

کی بجائے "handful of" مستعمل ہے - لیکن جب 'dreadful' bashful وغیرہ کلمے لکھے جاتے ہیں تو ان کے جزو "ful" کا اصل کلمے "full" سے معنوی رشتہ بالکل کمزور پڑ جاتا ہے اور وہ محض مشتق لاحقہ رہ جاتا ہے - لاحقہ "ly" - "lik" کا ایک روپ ہے جس کا مفہوم ہے ہئیت، جسم، شکل، اسی سے ایک مرکب manlik بنا - "like" اصلاً "ge-lic" (اسی شکل کا) تھا - ترکیب میں "lik" مخفف ہو کر "ly" رہ گیا - سابقہ "un" دراصل "ne" کی بدلی ہوئی شکل ہے لیکن "th" جس نے "true" کو "truth" بنا دیا ہے اور جو length اور health میں بھی موجود ہے، اپنی اصل کا پتہ انہیں دیتا۔ (۱) بعض سابقوں اور لاحقوں کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ آزاد اور مستقل کلموں کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں اور اب وہ محض علامات اشتقاق یا تعمیری کلموں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے لیکن تمام سابقوں اور لاحقوں پر اس نتیجے کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا - یہی حیثیت اشتقاقی اختتامیوں (flexional endings) یا تابع کلمات کی ہے - مثلاً پاکستانی، سرخی، خوبی، پگڑی، لکڑی وغیرہ میں "ی"۔ اگر ایک مخصوص معنوی ترمیم یا اضافے کے لئے ایک خاص صوتی عنصر کا اضافہ کیا جاتا ہے تو اسی عنصر کا اضافہ اور دوسرے کلمات میں ویسی ھی ترمیم کے لئے کیوں نہیں ھوتا رہا ؟ اردو میں "ی" اختتامیہ، صوتی و معنوی لحاظ سے ایک تابع کلمے کی حیثیت رکھتا ہے لیکن وہ ایک ھی مخصوص معنوی اضافے یا ترمیم کے لئے مستعمل نہیں- کبھی معنی اضافی نسبتی کے طور پر استعمال ھوتا ھے مثلاً شہری، ترکی، ایرانی

---

(۱) زبان - ماھئیت ارتقا اور آغاز یسپرسن ۳۷۷

پاکستانی، وغیرہ میں - کبھی معنی تانیث کا اضافہ کرتا ہے جیسے گھوڑی، بکری، لڑکی وغیرہ میں - کبھی تصغیری معنی پیدا کرتا ہے مثلاً پگڑی، لکڑی، صندوقچی وغیرہ میں - اسم صفت کے معنی بھی دیتا ہے جیسے سرخی، زردی، خوبی وغیرہ - لاحقہ ''الف'' اسمی معنی بھی دیتا ہے مصدری بھی اور صفتی اور فاعلی بھی - مثلاً گھوڑا، چونا، کتا، کیڑا وغیرہ میں '' ا '' سے اسمی معنی پیدا ہوتے ہیں - جھگڑا، ٹپکا، دھڑکا، میں مصدری اور اچھا کالا گندا، سوکھا وغیرہ میں صفتی - جھوٹا، بھوکا، لچا، اچکا وغیرہ میں فاعلی - ''ن'' حاصل مصدر کے معنی بھی دیتا ہے اور تانیث کے بھی مثلاً چلن، پھسلن، اسم آلہ کے معنی بھی دیتا ہے جیسے جھاڑن، ڈھکن وغیرہ - تانیث کا لاحقہ بھی ہے مثلاً دھوبن، مالن، وغیرہ - تانیث کے لئے متعدد لاحقے استعمال ہوتے ہیں، جیسے ''ن'' ''ائن'' ''نی'' ''انی'' - ''ی'' (لوھارن - مالن - منشیائن - ملانی - فقیرنی - مورنی - مہترانی - سیدانی - چماری - وغیرہ) ''س'' اور ''س'' دو سابقے ہیں اور دونوں سے نیک یا خوب کا مفہوم پیدا ہوتا ہے مثلاً سپوت، سگھڑ وغیرہ میں - نافیہ کے طور پر سابقہ '' ا '' بھی مستعمل ہے اور ''ن'' بھی (امر، اچھوت، امٹ، نڈر، نرالا، نچلا وغیرہ) ایسی بہت سی مثالوں سے یہ واضح کیا جا سکتا ہے کہ اضافی عناصر یا سابقوں اور لاحقوں کے استعمال میں کوئی خاص باقاعدگی نہیں رہی ہے - اگر باقاعدگی ہوتی تو ایک ہی عنصر متعدد معنوی اضافے یا ترمیم کے لئے یا بہت سے عناصر ایک ہی معنوی اضافے کے لئے استعمال نہ کئے جاتے - یہ رائے بھی ظاہر کی جاتی رہی ہے کہ یہ بے قاعدگی کی پیداوار ہے، قدیم ہندیو روپی زبانوں میں اس قسم کی بے قاعدگی نہ تھی - ہر سابقے کے مخصوص اور واضح معنی تھے اور ایک ہی گروہ کے تمام الفاظ پر ان کا اطلاق

ہوتا تھا - لیکن **میڈوگ** (Madvig) نے ۱۸۵۷ ھی میں عام ماہرین لسانیات کی اس رائے کی تردید اس طرح کر دی تھی کہ ''شروع شروع میں صرفی ھیئتیں مبہم' ڈھیلی ڈھالی اور سیال ھی ھوسکتی تھیں۔ قدیم ترین زبانوں میں ڈھلے ڈھلائے صرفی نظام ' کلموں کی منطقی ترتیب اور ان کے منضبط رشتوں کی توقع رکھنا عبث ہے - حیرت ہے کہ کچھ ماہرین لسانیات اس بات پر مصر رہے ہیں کہ فعل کی ہر حالت' ہر زمانہ ' اور ہر طور' منظم اور قطعی رہا ہے خصوصاً 'آریائی فعل' کے ''زمانہ'' کی ھئیتیں ایک مخصوص نظام کی پابند رہی ہیں - وہ افعال کے اختتامیوں کی سراغ رسی میں دور کی کوڑی بھی لاتے ہیں اور ان کا سلسلہ نسب ایسے مستقل کلموں سے ملا دیتے ہیں کہ سان گمان بھی نہیں ھوتا - ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''افعال'' کی ابتدائی ھئیتوں سے قطعیت کا نہیں بلکہ مختلف پہلوؤں کا اظہار ھوتا ھوگا اور ''دوران'' ''تکمیل'' ''نتیجے'' - ابتدا اور تکرار وغیرہ کے مفہوم کے گوشے بھی پیدا ھوتے ھوں گے اور بتدریج تغیرات کے بعد ان میں قطعیت پیدا ھوتی گئی اور ماضی' حال' ماضی تمام ' استمراری اور مختلف طور کا تعین ھوتا گیا - افعال کے اختتامیوں اور شخصی لاحقوں کو مستقل کلموں کے اجزا ثابت کرنے کی کوشش لا حاصل تو نہ تھی لیکن کلموں کے جوڑ اور اختلاط کی بہت سی توجیہات تشفی بخش نہیں ہیں۔ اسی لئے **یسپرسن** کا خیال ہے کہ زبان کے ترکیبی نظرئیے کو جوڑیا agglutination تک محدود کر دینا درست نہیں۔ وہ اسے Secretion Theory کہنا زیادہ موزوں سمجھتا ھے - اس نے اس نظرئیے کی اس طرح وضاحت کی ہے کہ ' ایک ناقابل تقسیم کلمے کا ایک حصہ صرفی دلالت اختیار کر لیتا ہے اور ایسا محسوس ھونے لگتا ھے جیسے کلمے

پر ایک اضافہ ہو اور جب اس طرح کا عنصر ایسے دوسرے کلموں میں جوڑا جانے لگے، جن میں یہ عنصر پہلے سے موجود نہ ہو تو اس کی کار فرمائی کا صحیح رنگ کھلتا ہے۔ انگریزی کی علامت جمع 'en' کو مثالاً پیش کیا جا سکتا ہے۔ قدیم انگریزی میں بیل کے لئے حالت فاعلی (واحد) کا کلمہ oxa تھا لیکن دوسری حالتوں (واحد) کے لئے oxan استعمال ہوتا تھا۔ یہی کیفیت n پر ختم ہونے والے دوسرے کلموں کی تھی haren. sterren apen) وغیرہ)۔ جب en علامت سمجھ لی گئی تو اسے ایسے کلموں میں بھی جوڑا جانے لگا جو n پر ختم نہیں ہوتے تھے۔ er بھی علامت جمع ہے۔ قدیم انگریزی میں cild کی جمع cildru اور وسطی انگریزی میں child کی جمع childer ہوئی اور اس میں بھی en کا اضافہ کردیا گیا۔ shoe, foe, eye کی جمع eyen shoen foen, بنائی جاتی رہیں۔

کبھی کبھی لاحقہ، اس کلمے سے، جس میں اسے جوڑا جاتا ہے، کچھ آوازیں مستعار لے لیتا ہے مثلاً قدیم انگریزی "lytel" میں لاحقہ "ing" کا اضافہ ہوا تو lytling بنا اور "ing" لاحقہ اصل کلمے کی آخری آواز "L" کو مستعار لے کر ling بن گیا اور پھر "ling" کو بھی ایک لاحقے کی حیثیت سے دوسرے کلموں میں جوڑا جانے لگا اور "hireling, duckling gosling, جیسے کلمے بنائے گئے۔ کلمے "olig" میں "archy" کے اضافے سے نیا کلمہ oligarachy بنا تو اسے oli + gorcky سمجھ لیا گیا اور پھر garchy کو لاحقہ بنا کر Poly میں بڑھایا گیا۔ اور نیا کلمہ polygarchy وضع ہو گیا اور عرصے تک رائج رہا۔

اردو میں تانیث کے لاحقے ''ی''۔ ''ن'' ۔ ''نی'' ۔ ''انی''
عام طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ان کا سلسلہ نسب سنسکرت تانیثی
لاحقوں ''نی'' ' اینی'' اور آنی سے ملایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر شوکت
سبزواری مرحوم کا قیاس ہے کہ سنسکرت لاحقہ تانیث ''ی: ''نی''
کا مخفف ہے ۔ لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ اصلی لاحقہ ''ی'' ہی
ہو اور اس نے اصل کلمے کی آخری آواز کے ساتھ مل کر ایک
نئی شکل اختیار کر لی ہو مثلاً کلمات ''ھرن'' . برھمن میں
لاحقہ تانیث بڑھا کر ''ھرنی'' - ''برھمنی'' کلمے بنائے گئے اور
پھر ''نی'' کو علامت تانیث سمجھ کر ''مور - فقیر - شیر اونٹ
وغیرہ میں ''نی'' کا اضافہ کر کے مورنی فقیرنی - شیرنی اونٹنی
وغیرہ کلمات بنائے گئے ۔

تمیز اور درجہ بندی انسان کی نمایاں خصوصیت ہے ۔
ہم بات چیت کے دوران دراصل مدرکہ مشابہت یا مغائرت کی
بنیاد پر غیر شعوری طور پر مختلف مظاہر کی درجہ بندی کرتے
رہتے ہیں - مظاہر کو ناموں سے موسوم کرتے وقت بھی یہی
رجحان کار فرما رہتا ہے اور ان کی مشابہت کا اظہار ناموں کی یا
کلموں کی ہم آہنگی سے بھی کیا جاتا ہے - جن مظاہر کی
دلالتوں میں کسی قسم کا کوئی اشتراک ہوتا ہے - ان کے لئے
کم و بیش ایک ہی قسم کے ہم آہنگ کلمے وضع کئے جاتے
ہیں - بعض اوقات یہ کہنا تو ممکن نہیں ہوتا کہ ہئیت یا
آہنگ کی یہ مماثلت کس طرح وجود میں آئی - بس یہ کہا
جا سکتا ہے کہ زیر غور کلموں میں مخصوص سیاق و سباق
موقع محل اور دلالت کے اعتبار سے کم و بیش مماثلت رہی
ہے - بعض اوقات یہ بتانا ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک ہی
زمرے کے کس کلمے نے اسی زمرے کے دوسرے کلموں کو

متاثر کیا یا اس زمرے کے دوسرے کلموں کی تخلیق کا موجب بنے -

قدیم انگریزی میں جانوروں کے نام کے لئے جو کلمے مستعمل تھے، ان میں سے چند کی اختتامیہ اصوات gga ہے مثلاً frogga ' stagga اور docga آج کل بجائے ان کے frog' stag اور dog مستعمل ہے - اسی طرح hook اور nook - utter اور mutter وغیرہ - گلگلا ہلپلا - رسمسا' کسمسا - جنتر' منتر اور تنتر - ان سب کا آھنگ ملاحظہ کیجئے — کپڑے ' وپڑے - گھر ' ور - گانا - وانا وغیرہ میں تابع مہمل کلمات کے آھنگ پر غور کیجئے - ان سب کی اختتامی آواز یا آوازوں کو لاحقہ قرار دے کر ان کے اصل کی کھوج میں کون ھلکان ہوگا - مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہت سے ہم آھنگ کلموں کی اختتامیوں کو نہ لاحقہ قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ جوڑ اور ارتباط کے عناصر -

ہم نے سطور بالا میں انسان کی حسِ تمیز اور درجہ بندی کی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے - اس ضمن میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ لسانی تقسیم یا درجہ بندی اور منطقی تقسیم یا درجہ بندی ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہوتی ہیں - اسے ذہن نشین کرنے کے لئے انسانی تجربوں کی درجہ بندی ضروری ہے - عموماً ھمارے تجربے مخلوط لیکن تالیف شدہ ھوتے ہیں اور ان کا انحصار ایسے عناصر پر ھوتا ہے جو متحد اور یک جان نظر آتے ہیں اور جنہیں مرکب یا مخلوط نہیں بلکہ اکائیاں سمجھا جاتا ہے — لیکن پیچیدگی اور تالیف ھی کی وجہ سے یہ ممکن ھوتا ہے کہ ایک تجربے کے کچھ اجزائے ترکیبی کو

دوسرے تجربے کے اجزائے ترکیبی کے مشابہہ اور کچھ مخصوص خصوصیات کی بنیاد پر ایک دوسرے سے متمائز سمجھا جائے۔ مثلاً درخت کا تجربہ کسی مخصوص درخت کو اپنے دامن میں سمیٹتا ہے فرض کیجئے وہ سیب کا درخت ہے۔ اس تجربے میں اس کا قد، ہئیت، رنگ روپ، بالیدگی کی خصوصیات، بلوغت، خزاں رسیدگی وغیرہ شامل ہوں گی۔ درخت کے دوسرے تجربے میں کچھ عناصر بھی ہوں کے کچھ مختلف۔ دونوں درختوں کی شاخیں ہوتی ہیں پتے ہوتے ہیں جڑیں ہوتی ہیں، دونوں پھلتے پھولتے ہیں۔ بلوغت کو پہنچتے ہیں، مرجھا کر مر جاتے ہیں، لیکن ایک پھل دیتا ہے دوسرا بے ثمر ہوتا ہے۔ مزید تجربوں سے ان کے اور اختلافات اور اشتراک کا علم ہوتا ہے یوں تو صنوبر، انناس، شاہ بلوط، بید، آڑو، سیب، امرود وغیرہ کے درخت، درخت ھی کی قسم میں شمار ھوتے ہیں۔ لیکن ان کے مزید ''تجربے'' ان کے اختلافات کو واضح کرتے چلے جاتے ہیں۔ تجرید اور تقسیم کے عمل سے ہم مظاہر کی کثرت کو اقسام اور درجوں میں بانٹ کر ان کی کثرت میں کمی کر لیتے ہیں جس سے ہمارے علم اور ہماری تہذیب کو ارتقا میں مدد بھی ملتی ہے۔ تقسیم اور درجہ بندی کے عمل سے انسان کے تجربوں کی صلاحیت کا التزام کیا جا سکتا ہے۔ یہ صلاحیت عام انسانوں میں موجود ہوتی ہے ھاں درجے اور نوعیت کا کچھ نہ کچھ فرق ھو سکتا ہے اور اسے مزید ترقی دی جا سکتی ہے۔ ہم علامات کی تعبیر کرتے رہتے ہیں اور غیر شعوری طور پر تجرید کی ہوئی مشترک خصوصیات کی بنیاد پر ان تعبیرات کو زمروں میں تقسیم کرتے ہیں عام انسانوں کے بیوھار اور عمل کا دارومدار ان ذھنی درجہ بندیوں پر ھوتا ہے جن کا انہیں شعور نہیں ھوتا۔ تاھم ھم

شعوری طور پر واقعات تجزئیے اور عام تقسیم اور درجہ بندی کی کوشش بھی کرتے ہیں - درجے اور زمرے بنائے جاتے ہیں - اس طرح کی تشکیل سے ان کی زیادہ سے زیادہ صراحت ہوتی ہے - شعوری درجہ بندی اور تقسیم کسی عملی مقصد کے ماتحت ہو سکتی ہے - سائنس میں یہ تقسیم معروضی شرطوں اور منطقی سوچ کے ماتحت ہوتی ہے - اور نفسیاتی اور سماجی زندگی کے تقاضے پوری کرنے والی غیر شعوری اور جبلی درجہ بندی سے مختلف ہوتی ہے - درجہ بندی کے ان دونوں طریقوں کے نتائج بھی مختلف ہوتے ہیں - شعوری اور سائنسی درجہ بندی کی روح سے ''وھیل'' مچھلی کے زمرے میں نہیں آتی لیکن عام جبلی درجہ بندی اسے مچھلی کے زمرے میں لے آتی ہے - سائنسی درجہ بندی میں تجربات کو عقل کی روشنی میں دیکھا اور ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور نتیجے میں مرتب ہونے والے زمرے بنیادی طور پر تمام انسانوں کے لئے یکساں ہوتے ہیں اس کے برعکس جبلی درجہ بندی عملی زندگی کی روشنی میں کی جاتی ہے اور عملی زندگی منطقی سوچ سے مختلف ہوتی ہے - عملی زندگی انسانی عضویات کے ان ردعمل سے ترکیب پاتی ہے جو طبیعی ، عضلاتی ، نفسیاتی اور سماجی کوائف اور شرائط سے ظہور پذیر ہوتے ہیں - اور ان کوائف میں سے اکثر زمان و مکان کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں اس لئے جو عملی درجے اور زمرے ان کے مرھون منت ہوتے ہیں - وہ ایک دوسرے سے خاصے مختلف ہو جاتے ہیں - چوں کہ زبان - سوچ یا فکر کے اظہار کا ذریعہ ہے اس لئے یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ منطق کی درجہ بندی کے ادعات زبان میں بھی ہوتے ہیں - اور شاید اسی لئے ابتدائی قواعد نویس جو ارسطو کے فلسفے سے متاثر تھے دس لسانی زمروں یا درجوں کے وجود

کو تسلیم کرتے رہے اور بہت دنوں تک گرامر کو منطق کا طفیلی سمجھا جاتا رہا - اب بھی منطقی گرامر کا طلسم کچھ نہ کچھ برقرار ہے لسانی ساخت میں جو اقسام یا زمرے ملتے یا اس سے اخذ کئے جاتے ہیں وہ غیر شعوری اور عملی ہوتے ہیں منطقی نہیں - وہ جبلی یا فوری طور پر ترتیب دے لئے جاتے ہیں اور استعمال میں لائے جاتے ہیں ان سے لسانی مواد کی تشکیل اور تنظیم میں مدد ملتی ہے اور انفرادی اظہار اور سماجی ابلاغ کے لئے علامات کا موزوں نظام وجود میں آتا جاتا ہے — گرامر کا کام اقسام اور زمرے وضع کرنا اور پھر ان کی مثالیں زبان میں تلاش کرنا نہیں بلکہ لسانی مواد کو ان کی ہیئت اور تفاعل کے لحاظ سے عمومی زمروں میں تقسیم کرنا ہے - لسانی زمرے یا اقسام مثالی معنوی وصوتی نمونے ہوتے ہیں جن کے تجربے زبان کے عام بولنے والوں کو جبلی طور پر ہوتے رہتے ہیں اور جنھیں وہ مروجہ زبان سے اخذ کرلے ہیں اور جن پر سے قیاس کرکے نت نئی معنوی وصوتی ہیئتیں تخلیق کرتے اور سرمایہ الفاظ میں اضافہ کرتے رہتے ہیں - لسانی ارتقامیں قیاس تمثیلی کا کردار نہایت اہم ہوتا ہے — انگریزی میں تقابل صفت کا اظہار دو طریقوں سے کیا جاتا ہے — پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ صفت کے آخر میں لاحقہ er یا est لگا دیا جائے - دوسرا یہ کہ صفت سے پہلے more یا most بڑھا دیا جائے - قیاس تمثیلی نے صفت perfect میں بھی more اور most کا اضافہ کر دیا حالانکہ منطقی اعتبار سے " perfect " کے کیا درجے ہوسکتے ہیں ؟ اسی طرح اردو میں فارسی کی تقلید میں بد ، بہ ، خوب وغیرہ سے بدتر، بدترین، بہتر ، بہترین ، خوب تر ، خوب ترین وضع کئے گئے اور

قیاس تمثیلی نے مکمل سے ''مکمل ترین'' بھی کہلوایا حالاں کہ منطقی طور پر '' مکمل '' کے تین درجے نہیں ہوسکتے - '' آتش گیر '' '' راہ گیر '' پر سے قیاس کرکے '' کف گیر '' وضع کیا گیا - منطقی طور پر جس اسم آلہ کے لئے یہ مرکب وضع کیا گیا ہے وہ کف کو نہیں پکڑتا بلکہ اسے کف میں پکڑا جاتا ہے - انگریزی زبان کی وسعت اور زرخیزی کو کون نہیں جانتا لیکن اس میں مرموزیت کی لسانی ساختیں اتنی زیادہ ہیں کہ کسی مخصوص درجہ بندی کا احساس پیدا نہیں ہوسکتا - تجریدی مرموزیت کے کچھ وسائل ایسے ہیں کہ قیاس تمثیلی کے عمل کی خاصی گنجائش نکل آتی ہے - مثلاً منطقی تجرید سے '' نیلاہٹ '' کا تصور قائم کیا جاسکتا ہے - اور اسم صفت '' نیلا '' اور لاحقہ '' ہٹ '' کی ترکیب سے لسانی مرموزیت کا جامہ پہنایا جاسکتا ہے - اسی لاحقہ کو ایسے ہی حالات میں عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور وہ ایک ایسی ہئیت کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے جس سے تجریدی , دلالت کی مرموزیت ہوتی ہے - پھر وہ دوسرے اسمائے صفات بلکہ دوسرے کلمات کے ساتھ بھی استعمال ہونے لگتا ہے — ness کا لاحقہ blueness کے ساتھ بھی مستعمل ہے حالاں کہ to gether میں جس نوعیت کا تصور ہے وہ together ness میں نہیں اس طرح تجریدی تصور اور کلمات کے اضافے کی سہولت ہو جاتی ہے - بعض زبانوں میں باقاعدہ مرموزیت کے ذریعہ تجرید کے اظہار کے ذرائع ہوتے ھی نہیں — اردو کوئی زبان بولنے والا '' آسمان کی نیلاہٹ '' کہنے کے بجائے یہ کہے گا کہ '' آسمان کتنا نیلا ہے '' یہ حقیقت کہ لسانی

درجے اور تقسیمیں منطق سے زیادہ دوسرے محرکات کی مرہون منت ہیں مندرجہ ذیل مثالوں سے واضح کی جاسکتی ہے۔

انگریزی کے دو عام جملے ہیں " I look " اور " I see "معنی سے قطع نظر لسانی نقطۂ نظر سے ان میں کوئی فرق نہیں ۔ دونوں میں مبتدا اور خبر ہیں اور دونوں میں فعل معروف ہے۔ لیکن آئیے دونوں جملوں پر غور کریں۔ پہلے جملے میں ایسا عمل ہے جسے فاعل " I " انجام دیتا ہے۔ دوسرے میں محض ایک ادراک ہے جو نتیجہ ہے آنکھ کے پردے کے کرشمے کا جس سے فاعل " I " متاثر ہوتا ہے معروضی طور پر " I look " کا دلالتی پہلو معروف ہے اور " I see " کا مجہول " I suffer " " I am " " I become " " I under go " وغیرہ میں بھی فعل کو معروف قرار دیا جاتا ہے حالاں کہ منطقی طور پر مجہول ہے۔ " دروازہ کھلتا ہے " اور " پردہ گرتا ہے " جیسے جملوں میں لسانی طو پر عمل معروف ہے لیکن منطقی طور پر مجہول کیوں کہ دروازہ کھولا جاتا ہے اور پردہ گرایا جاتا ہے۔

غیر حقیقی یا قواعدی جنس پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس کی بھی کوئی منطقی توجیہ نہیں ہوسکتی خصوصاً آریائی زبانوں میں تین جنسوں کی توضیح و توجیہ ممکن نہیں۔ آخر آریاؤں نے ہاتھ ، پیر ، مکان ، شہر وغیرہ کے لئے استعمال ہونے والے کلموں کو بخصوص " جنس " کیوں کر بخش دی اور مذکر ، مونث اور بے جنس (Newter) کیوں قرار دینے لگے — بروگ مین کا خیال ہے کہ قدیم انسان

بے جان اشیا کو بھی جاندار سمجھتا تھا ، اس لئے اس نے
ان میں بھی جنس کی پرچھائیاں دیکھ لیں ـ لیکن سچ پوچھئے
تو غیر حقیقی جنس محض ہیئتیں ہیں جنھیں تذکیر و تانیث
سے دور کا واسطہ بھی نہیں ۔ اور زبان ان میں سے ایک ہی
" جنس " استعمال کرتی ہے ۔ مثلاً اگر میز ، کرسی وغیرہ
کسی زبان میں مونث استعمال ہوتی ہیں تو اسی زبان میں ان
کے مذکر کے لئے کلمے نہ ہوں گے ۔ اور پھر اکثر زبانوں
میں کلموں کی تذکیر و تانیث بدلتی بھی رہی ہے مثلاً جرمن
زبان میں بہت سے ایسے کلمے جن کا اختتام " e " پر ہوتا
تھا ، پہلے مذکر سمجھے جاتے تھے بعد میں وہی کلمے مونث
سمجھے جانے لگے ۔ بعض زبانوں میں لاحقہ " a " تانیث کی
علامت سمجھا جانے لگا ہے ۔ اردو میں عام طور پر الف کو
تذکیر کی اور " ی " کو تانیث کی علامت قرار دیا جاتا ھے
مستثنیات بھی گنوادی جاتی ہیں یہ اور بات ہے کہ مستثنیات
کی تعداد بھی اچھی‌خاصی ہوتی ہے ان علامتوں اور لاحقوں کا
فطری جنس سے کیا تعلق ہوسکتا ھے اور منطقی طور پر ان
سے تذکیر و تانیث کا فیصلہ کیسے ہو سکتا ھے ؟ ممکن ھے
فطری مونث کے لئے جو کلمے استعمال ہوتے ان کی اختتامیہ
آوازوں پر سے قیاس کرکے دوسرے کلمات تانیث وضع کرلئے
گئے مثلاً mama (ماں) gena (عورت) پر سے قیاس کرکے
deus (دیوتا) سے dea (دیوی) equas (گوڑا) سے equa
(گھوڑی) جیسے کلمے بنائے گئے ۔ بلیک (Bleek) نے
بروگ مین سے کئی سال پہلے ہندیوروپی زبانوں سے بالکل
مختلف زبان ہوٹن ڈوٹ میں جنس کے تصور سے بحث کرتے
ہوئے یہ کہا تھا کہ جنس کی تفریق جسے حقیقی جنس سے کوئی

منطقی تعلق نہیں ، جنس کی تمیز کے لئے استعمال کی جانے لگی - یہ محض اتفاق تھا کہ مرد اور عورت پر دلالت کرنے والے کلموں میں مختلف اختتامیہ آوازیں تھیں ، قیاس تمثیلی کا کرشمہ یہ ہوا کہ ان آوازوں کا اضافہ دوسرے کلموں پر کرکے جنس کی تمیز کا اظہار کیا جانے لگا اور جب ایسے کلموں کی معتدبہ تعداد استعمال ہونے لگی تو ان اختتامیہ آوازوں کو تذکیر و تانیث کی علامات قرار دیا جانے لگا

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ انسان کے موضوعی احساس نے مظاہر میں تفریق کرنے اور انہیں قسموں میں بانٹنے کا رجحان پیدا کیا اور مظاہر سے متعلق بھی ''جنس'' کا تصور پیدا ہوا جہاں مذکر ، مونث کا تصور پیدا نہ ہوسکا وہاں '' بے جنس'' کے تصور نے جنم لیا — لیکن یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ایک ہی زبان بولنے والوں میں وقت کے ساتھ ساتھ یہ تصور بدلتا رہا ہے اور کلموں کی تقسیم جنس کینچلی بدلتی رہی ہے - ایک نسل جن کلموں کو مذکر قرار دیتی رہی ہے دوسری نسل انہی کو مونث قرار دینے لگی - کبھی ایسا بھی ہوا کہ ایک زبان میں کلموں کی جو جنس تھی وہ دوسری زبان تک پہنچ کر بدل گئی مثلاً سنسکرت اور پراکرتوں میں جو کلمے مذکر تھے اردو میں مونث ہوگئے اور ان کے بعض مونث اسم اردو میں آکر مذکر ہوگئے سنسکرت اور پراکرت میں جن مونث اسموں میں علامت تانیث تھی ، وہی جب اردو میں آئے تو گھس پس کر ایسے ہوگئے کہ کوئی علامت تانیث باقی نہ رہی - مثلاً سنسکرت کے کلمے کھٹوا ، چھاپا ، ندوا ، رکھشا ،

ولگ وارتا وغیرہ اردو میں کھاٹ ، چھاؤں ، نیند ، راکھ ، باگ ، بات بن گئے اور سنسکرت کی علامت تانیث "ا"، ختم ہوگئی - اردو اسمائے مانعہ میں سے اکثر کی اختتامیہ آواز "ی" ہے لیکن "ی" پر ختم ہونے لگے بہت سے کلمے مذکر بھی ہیں مثلاً پانی ، موتی ، مالی ، ھاتھی ، گھی وغیرہ - ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ ان میں "ی" تانیث کی علامت نہیں بلکہ اصل کلمے کا جزو ہے جو سنسکرت "زیر" کے اشباع سے وجود میں آئی ہے - اردو میں "ن" ، ائن ، نی ، اور ، انی ، بھی علامات تانیث کے طور پر استعال ہوتے ہیں اردو میں اسمائے مانعہ ہی نہیں بلکہ صفات، مشتقات ، افعال بھی جنسوں میں تبدیل کئے جاتے ہیں اور جنس کے اعتبار سے تصریف اور گردان کی جاتی ہے - قدیم ہندیوروپی زبانوں کی طرح سنسکرت اور پراکرتوں میں جنس کی تین قسمیں ہوتی تھیں اردو تک آتے آتے دو رہ گئیں - یہ اور بات ہے کہ اس کی معاصر زبانوں مراٹھی ، گجراتی، سنھالی میں تینوں قسمیں موجود ہیں ، بنگالی اور اڑیا میں تذکیر اور تانیث کا فرق بھی نہ رہا -

ایک ہی خاندان کی زبانوں میں مشترک ورثے میں ملنے والے کلمات کی تذکیر و تانیث میں بڑا اختلاف نظر آتا ہے - یورپ کی بہت سی زبانوں میں لاطینی کے کلمات نے جنس کی مختلف قسمیں اختیار کرلیں - فرانسیسی ، ہسپانوی اور جرمن زبانوں میں اس کی مثالیں زیادہ ملتی ہیں جرمن زبان میں Person (شخص) waise (یتیم) wacht (محافظ)

Memme (بزدل) مونث ہیں اور Kunde (گاہک) Diensbote (نوکر) Kerl (ساتھی) وغیرہ مذکر — فرانسیسی میں اس کے برعکس — لاحقہ " chen " کو بے جنس کی علامت سمجھا جاتا ہے اس لئے جس کلمے کے آخر میں یہ آواز ہو اسے مونث قرار دیتے ہیں خواہ منطقی طور پر غلط ہی کیوں نہ ہو مثلاً " لڑکی " کے لئے کلمہ " das Hadchen " ہے اس کے آخر میں chen ہے اس لئے اسے " بے جنس " قرار دیا جاتا ہے —

بعض زبانوں میں قیاسی تمثیلی کے طفیل جنس کی تقسیم کے لئے معتدبہ سرمایہ اور اس میں زائد یا لاحقی آوازوں کی یکسانیت تذکیر و تانیث کے قواعد مستنبط ہو جاتے ہیں اور پھر ان کا اطلاق دھڑلے سے ہوتا ہے - اردو اور بعض جدید ہندآریائی زبانوں میں مشتقات صفات ، افعال ، معاون افعال ، بلکہ حروف تک پر اس کا عمل جاری ساری ہو گیا — مثلاً لڑکی کی گڑیا - بڑھے گی - کھاتی ہے — میری کتاب - حالاں کہ " کا " - " گا " " را " مستقل اور آزاد کلمے ہیں لیکن مونث کے ساتھ یہ بھی مونث بنا دیئے گئے -

ان مباحث سے یہ نتیجہ نکلا جاسکتا ہے کہ اکثر حالات میں " جنس " غیر شعوری اتفاق اور تصریف اور گردان کی روایتی اور میکانکی عادت کے سوا کچھ نہیں - اور اس سے غیر حقیقی یا قواعدی جنس کی تجرید اور تشکیل کرلی جاتی ہے - اس لئے یہ کہنا کہ غیر حقیقی جنس کی تقسیم ،

قواعدی تصور پر استوار ہوتی ہے ، درست ہے ۔

دوسری لسانی تقسیم جس کا دارومدار انسان کے طرز احساس اور اپنے حوالی کی طرف رویے پر ہوتا ہے ، واحد ، جمع کی تقسیم ہے - یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تقسیم عدد کی معروضی تقسیم اور صیغوں کے دو پہلو ہیں لیکن یہ تصور کہ مظاہر کو واحد اور جمع میں تقسیم ہونا چاہیئے ، من مانا ہی کہلا سکتا ہے - آخر '' ایک '' کو ایک صیغہ اور باقی تمام کو دوسرا صیغہ قرار دینے کا منطقی جواز کیا ہو سکتا ہے بعض زبانوں میں مزید تقسیم کے قرائن بھی نظر آتے ہیں - مثلاً اردو میں ایسے کلمے بھی ہیں دونوں ، جوڑی ، جوڑا ، درجن ، کوڑی ، سیکڑہ وغیرہ - قدیم ہندیوروپی میں عدد کے تین صیغے ہوتے تھے - قدیم ہندآریائی میں بھی یہی صورت تھی - پراکرتوں میں تثنیہ کا صیغہ ختم ہو گیا - جدید ہندآریائی میں اب دو ہی قسمیں ہیں - واحد اور جمع - اردو میں کچھ اسم ایسے بھی ہیں جو فعل لازم کی فاعلی حالت میں اپنی ہیئت نہیں بدلتے اور ان میں کسی قسم کے لاحقے کا اضافہ نہیں ہوتا - آدمی ، گھر ، برتن صیغہ واحد میں ہوں یا جمع ، ان میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی - آدمی آئے ، گھر بنے ، برتن گرے میں یہ کلمے جمع ہیں لیکن ان کی ہیئت بدستور وہی ہے جو واحد صیغے میں تھی - ان مثالوں میں افعال بھی جمع کے صیغے میں ہیں — '' لڑکے آئے '' '' گھوڑے بھاگے '' ان مثالوں میں بھی فاعل کے صیغے کے لحاظ سے فعل کا صیغہ بھی جمع کا ہے - لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ '' عمل '' بھی جمع کی صورت میں ہوا ہے یا فعل کا اختتامیہ

'' ے '' عمل کی جمع کا تصور پیش کرتا ہے - جمع کا تصور
دراصل '' لڑکے '' اور '' گھوڑے '' سے ظاہر ہوتا ہے
اردو زبان میں جمع کی علامتیں یا لاحقے چار ہیں - تین لاحقے اسم
کی قائم حالات میں بڑھائے جاتے ہیں ان کو فاعلی لاحقے کہہ سکتے
ہیں .مثلاً (۱) '' ے '' (گھوڑے ' لڑکے ' کتے وغیرہ میں) ...
(۲) '' یں '' (عورتیں ' صورتیں ' شکلیں وغیرہ میں) - (۳)
'' اں '' یا '' یاں '' (لڑکیاں ، گھوڑیاں ' وغیرہ میں) —
ایک لاحقہ غیر فاعلی ہوتا ہے '' وں '' یا یوں '' جو اسم کی
محرف صورت میں لگایا جاتا ہے مثلاً ' لڑکوں ' مردوں وغیرہ
علامت جمع کو ہورنلے لاحقہ اضافت بتاتا ہے - اس کے آخر
میں '' لوگ '' یا '' جماعت '' قسم کا کوئی کلمہ تھا جو جمع
کا اظہار کرتا تھا اور بعد میں حذف ہوگیا — '' ے '' اصل
میں سی تھا جو '' ہے '' ہوا اور پھر '' ہ '' گر گئی - اگر
ہورنلے کی رائے درست ہو اور واقعی جمع کے اظہار کے لئے
'' لوگ '' یا '' جمع '' قسم کا کلمہ بڑھایا جاتا ہو تو اسے
دراوڑی زبانوں کا اثر قرار دیا جاسکتا ہے کیوں کہ ان زبانوں
میں جمع بنانے کا بھی قاعدہ ہے —

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ فاعل جمع ہو تو اس
کی رعایت سے اردو میں فعل کو بھی جمع لاتے ہیں لیکن اس
سے عمل کی جمع مراد نہیں ہوتی — لیکن بعض مکرر مصادر
یا ایسے حکائی مادے جن میں صوتی تکرار ہو ' عمل کی تکرار
کو ظاہر کرتے ہیں مثلاً کھٹکھٹانا ' بڑبڑانا ' چڑچڑانا '
بھڑ بھڑانا یا کھٹکھٹ وغیرہ —

اسم کی اعرابی حالات کے اظہار کے لئے بھی لاحقے استعمال

ہوتے رہے ہیں - قدیم زبانوں میں عموماً اعرابی حالت ظاہر کرنے کےلئے کلمے کے ساتھ لاحقوں کا اضافہ کردیا جاتا تھا - ان زبانوں میں اعرابی حالت کی تعداد خاصی ہوتی تھی - مثلاً سنسکرت میں اسم کی اعرابی حالتیں آٹھ ہوتی تھیں - اور متصل لاحقوں یا کلمے کے خفیف سے تغیر کے ذریعے ظاہر کی جاتی تھیں گویا یہ حالتیں زیادہ تالیفی تھیں — جدید ہندآریائی کی بعض زبانوں میں بھی یہی آٹھ اعرابی حالتیں ہیں لیکن ان میں سے اکثر آزاد اور جداگانہ کلموں کے ذریعے ظاہر کی جاتی ہیں دوسرے لفظوں میں انھیں تحلیلی کہا جاسکتا ہے . سندھی اور مراٹھی میں تالیفی حالتیں زیادہ ہیں اور اردو میں کم . اردو میں ظرفی حالت کی مثالیں ''کنارے'' ''سہارے'' ''آگے'' ''نیچے'' ''تلے'' وغیرہ سے دی جاسکتی ہیں . ان سب میں ''ے'' سنسکرت کی ظرفی علامت کی یادگار ہے اور تالیفی حالت کی مثال - ''دھیرے'' میں آلی حالت کا اظہار ہے اور تالیفی علامت کی ایک اور مثال سامنے آجاتی ہے - سنسکرت اور پراکرتوں میں تینوں جنسوں (مذکر ، مونث ، بے جنس) کے لئے الگ الگ فاعلی علامتیں تھیں - ''آپ بھرنش'' کے دور تک اسموں کی قسمیں بھی کم ہوتی گئیں اور بعض زبانوں میں اعرابی حالتیں بھی اور فاعلی حالت کے لئے کوئی مخصوص علامت بھی نہ رہ گئی —

سنسکرت ، پراکرتوں اور جدید ہندآریائی زبانوں کے تقابلی مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زبانیں کس طرح پیچیدگی سے آسانی کی طرف سفر کرتی رہی ہیں - ابتدا میں

کلمے خاصی بھاری بھر کم اور طویل رہے ہیں ، ان میں خفیف صوتی تبدیلیوں یا اضافوں سے نت نئے معانی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی اور صرفی تقسیم ، نحوی ترکیب ـ کلمات کی قسموں اور صوتی اضافوں ، علامتوں اور لاحقوں وغیرہ کی کثرت اور رنگا رنگی نے زبان کو خاصا بوجھل اور دوسری زبان بولنے والوں کے لئے خاصی مشکل بنا رکھا تھا - انفرادی اور سماجی تقاضوں کے ماتحت قیاس تمثیلی نے نت نئے کلمات وضع کروائے - ان کے تفاعل اور اختتامی مماثلت نے کلمات کی تقسیم کا احساس پیدا کیا اور آہستہ آہستہ گرامر اور اس کی شقیں وجود میں آئیں اور پھر ان کی پابندی کرتے ہوئے نئے کلمات اور نئے اسالیب پیدا کئے گئے - سالہا سال کے تجربوں نے جو صوتی تغیرات اور اضافے کئے اور ان سے جو معانی تراشے ان کی بدولت زبانیں ارتقائی منزلیں طے کرتی رہیں ۔ ان تبدیلیوں اور اضافوں نے اختتامیوں ، علامتوں اور لاحقوں کی حیثیت پائی اور ان کی وجہ سے زبانوں میں جوڑ ، تالیف ، ترکیب ، ادغام ، ارتباط ، توسیع لاحقات ، secretion وغیرہ کی خصوصیات پیدا ہوتی گئیں - ایک ہی زبان میں آہستہ آہستہ یہ تمام صورتیں کارفرما ہوتی رہیں ، ارتقائی عمل میں ایک صورت کی کارفرمائی ختم ہو کر دوسرے کی کارفرمائی کے لئے میدان بھی ہموار ہوا — لیکن کسی صورت کی کارفرمائی کلیتہ ختم نہیں ہوئی — تحلیلی زبانوں سے تالیف اور ترکیب کی مثالیں یکسر ناپید نہیں ہوگئیں بلکہ پہلو بہ پہلو رہیں چوں کہ کوئی زبان کلی طور پر ارتباطی ، انضمامی ، یا تحلیلی نہیں ہوتی ، اس میں کوئی ایک صورباتی خصوصیت

دوسری صورياتی خصوصيات کے مقابلے پر زیادہ نمایاں ہوتی ہے ، اس لئے بعض ماہرین لسانیات انہیں دو گروہوں میں تقسیم کرکے زیادہ ترکیبی اور زیادہ تحلیلی قرار دیتے ہیں اور زیادہ ترکیبی کے زمرے میں ارتباطی یا اتصالی اور انضمامی زمروں کو بھی شامل کرلیتے ہیں گویا " زیادہ ترکیبی " میں ترکیب و تالیف کی تمام صورتیں مراد لے لی ہیں ۔ اور جن زبانوں میں ترکیب و تالیف کے مقابلے پر مستقل اور آزاد کلموں کا استعمال زیادہ ہوتا ہے ۔ انہیں زیادہ تحلیلی کہا ہے ۔ لیکن ترکیب و تالیف کی تمام صورتوں کو ایک ہی زمرے میں شمار کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان میں فرق و امتیاز نہ کیا جائے - مرکبات و مشتقات کے امتیاز اور مرکبات کی مختلف نوعیتوں اور مشتقات کی گوناگوں صورتوں کے فرق سے لسانی گروہ بندی اور انضباط کی راہیں ہموار ہوتی ہیں اور زبانوں میں نظم و ترتیب قائم ہو کر ان کی توسیع کے امکانات روشن ہوتے ہیں اور وہ ارتقائی منازل طے کرتی ہیں -

مرکبات و مشتقات کے ضمن میں بعض بنیادی سوالات بھی ذہن میں ابھرتے ہیں مثلاً زبان میں دلالت کی اکائیاں کیا ہوتی ہیں - ان اکائیوں کی نوعیت اور باہمی تعلق کیا ہے ۔ کلمے اور جملے کی ماہئیت کیا ہے ۔ کلمے کی تشکیل اس کی توسیع ، اس کی صوتی و معنوی کیفیت کن مراحل سے کس طرح گزرتی ہے ۔ زبان میں صوتی ، رکنی ، معنوی نظم و ترتیب کیا اور کیسے ہوتی ہے - زبان اور نظام لسان میں کیا تعلق ھے - سادہ اور صرفی کلماتی نظام

کیا ہوتے ہیں - کلموں اور جملوں میں باہمی رشتہ کیا ہوتا ہے - کیا یہ رشتہ اسی قسم کا ہے - جس قسم کا کسی ''کل'' اور اس کے اجزا میں ہوتا ہے یا کلموں کا نظام بالکل الگ ہوتا ہے - ان سوالات کا جواب پانے کے لئے دلات کی اکائیوں کی صوتی' رکنی ' صرفی اور معنوی تنظیم ' مرکبات کو نوعیتوں ' مشتقات کی صورتوں وغیرہ سے بحث ناگزیر ہوجاتی ہے -

دلالت کی اکائیاں
لسانی ارتقا میں انکا کردار

زبان کے آغاز سے متعلق مختلف نظریات کا جو تنقیدی جائزہ پیش کیا جاچکا ہے — اس سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل ہے - کہ اولین نطق انسانی کا آغاز کب ہوا - اس طرح تاریخی اعتبار سے کسی زبان کے کسی جملے یا کلمے کو اس کا نقطۂ آغاز قرار دینا ممکن نہیں - اگرچہ لسانیات ارتقا کے کئی مدارج طے کر چکی ہے اور اب اکثر حلقوں میں اسے ایک سائنس یا سماجی علم قرار دیا جاتا ہے لیکن یہ بتانا بھی ممکن نہیں کہ کسی زبان کا کوئی مستقل کلمہ کب وجود میں آیا اور اس کا قطعی سرچشمہ کیا ہے — کلمے کی ماہئیت کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ یہ بھی سمجھا جائے کہ وہ کب وجود میں آیا - تاریخ ہمیں یہ بتانے سے قاصر ہے کہ کلمہ کب اور کس طرح وجود میں آیا لیکن سماجی نفسیات کے اصول یہ ضرور بتاتے ہیں کہ جملے کو کلمے پر تقدم حاصل ہے - گویا زبان کی اولین اکائی جملہ ہے - اور کلماتی تقسیم بعد کی پیداوار -

یہ حقیقت ہے کہ زبان ادلتی بدلتی رہتی ہے - لیکن اس

کی تبدیلیاں غیر محسوس طور پر ہوتی ہیں اور ایک خاص دور میں زبان کے بولنے والوں کو یہ شعور ہوتا ہے کہ وہ وہی زبان بول رہے ہیں جو ان سے کچھ پہلے بولی جاتی تھی ۔ عام بولنے والے جس لسانی مواد کو کام میں لاتے ہیں اسے جماد سمجھ لیتے ہیں ۔ وہ جن تغیرات کے موجب ہوتے ہیں ، وہ غیر شعوری اور غیرارادی ہوتے ہیں ۔ ان کے لئے تو کلمے کا چلن ہی اہمیت رکھتا ہے اور کلمہ ایک جاریہ قدر ہوتا ہے ۔ زبان کی وہ تبدیلیاں جو ماضی میں ہوچکی ہوتی ہیں اور بہت زیادہ غیر معمولی اور نمایاں ہوتی ہیں، انہی پر لوگوں کی نظر پڑتی ہے ۔ زبان کی تغیراتی خصوصیت کا علم صرف ماہرین لسانیات کو ہوتا ہے ۔ کلمے کے جمود کے اضافی تصور ہی کی بدولت زبان سماجی ابلاغ کا پورا پورا حق ادا کرتی ہے ۔ جب ہم کسی کلمے کے ماضی کا سراغ لگاتے ہیں تو اس کی ہر کڑی دراصل ماضی کے مختلف ادوار کے جامد کلمے کی نمائندگی کرتی ہے ۔ ان کا باہمی تقابل تغیرات کی غمازی کرتا ہے ۔ تاریخی توضیح و تعبیر اور تغیرات کا استنباط تو مشاہدہ یا مطالعہ کرنے کا کام ہے ۔

جدید لسانیات میں ایک اصطلاح "صوتی کلمہ" بھی استعمال کی جاتی رہی ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کلمے کی تشکیل کے لئے اصوات بنیادی شرط ہیں ۔ لیکن کلمے صرف اصوات کے مجموعوں کا نام نہیں ، اگر اصوات کے ان مجموعے میں اظہاریت یا ابلاغ نہ ہو تو انہیں کلمے نہیں سمجھا جائے گا ۔ کلمے کے لئے کسی مخصوص صوت

یا اصوات کی مخصوص تعداد یا نوعیت کا التزام نہیں کیا جاسکتا — ان سب کا دارومدار صورت حال اور معروضی کوائف پر ہوتا ہے - تاریخی گرامر اور اشتقاقیات کے شعبے ان کی توضیح اور توجیہ کرتے ہیں ۔ سچ پوچھئے تو اہمیت کے عناصر میں وہ صوتی مواد شامل ہوتا ہے جسے زبان کا جزو ترکیبی سمجھا جانے لگتا ہے یا ترکیب و تالیف انضمام وانضباط ، تفریق وامتیاز اور تحلیلی کی وہ عادتیں ، اہم سمجھی جاسکتی ہیں ، جو ایک خاص وقت یا دور میں رائج ہوں

لسانی مواد اصوات اور ان کی ترکیب و تالیف پر مشتمل ہوتا ہے — لیکن انسان کے منہ سے نکل سکنے والی تمام آوازیں زبان کا صوتی مواد نہیں بنتیں - ہر زبان بہت کم صوتی مواد سے کام لیتی ہے — لیکن یہ مواد , نطقی سمعی اور نفسیاتی سیاق کی خصوصیت کے لحاظ سے باقاعدہ زمروں میں تقسیم ہوتا ہے — کلموں کی تشکیل میں صوتی ترکیب و تالیف کی زیادہ سے زیادہ کارفرمائی ہوسکتی ہے - لیکن اس کی نوعیت ہر زبان میں ایک سی نہیں ہوتی - اصوات کی طرح ان کی بھی تنظیم اور درجہ بندی بولنے والوں کے ذہنوں میں مرتب ہوجاتی ہے — اصوات اور ان کی ترکیبیں دوسری اصوات اور ترکیبوں کے ساتھ ترکیب پاتی رہتی ہیں اور ترکیب کا یہ عمل زبان بولنے والوں کی صوتی عادتوں پر منحصر ہوتا ہے - اگر یہ عادتیں عام حرکی (motor) اور سمعی لوازمات پر مبنی ہوں تو تمام زبانوں میں صوتی ترکیب کی نوعیتیں یکساں ہوسکتی ہیں - آواز کی طرح " سلیبل " بھی انسانی جبلت کا حصہ ہے اور رکنی اور

غیر رکنی آوازوں کے تواتر ہی سے کلمے تشکیل پاتے ہیں۔ لیکن مختلف زبانوں کے بولنے والے آوازوں کو مختلف طریقوں سے ترکیب دینے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ان صوتی عادتوں کی وجہ سے زبانوں کے صوتی نظام میں ممتاز خصوصیت پیدا ہو جاتی ہیں۔ اردو میں مصمتی خوشوں کا فقدان ہے۔ خصوصاً کلموں کے آغاز میں۔ اطالوی میں مصمتی خوشے شاذونادر ہی ملتے ہیں بہت سی زبانوں مثلاً انگریزی سنسکرت وغیرہ میں مصمتی خوشوں کی کثرت نظر آتی ہے۔ جدید ہند آریائی زبانوں میں کلمے کا آخری مصوتہ حذف ہوگیا ہے اس کے بر عکس اطالوی کلمے کے آخر میں عموماً مصمتہ نہیں ہوتا۔ انگریزی میں pn ps کسی رکن کے آغاز میں نہیں آتے۔ اردو کا کوئی کلمہ ژ نون غنہ یا مخی نون سے نہیں شروع ہوتا۔ صوتی ترکیبوں اور سرموزیت کی عادتوں سے کلموں کی صوتی خصوصیات متعین کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ صوتی عادتوں کو دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) آوازوں کو متحد کرنے کی عادت اور (۲) آوازوں کو الگ کرنے (Islolation) کی عادت۔ ترکیبی زبانوں میں بہت سی صوتی ترکیبیں الگ الگ کر لی جاتی ہیں اور بنیادی اور تعمیری عناصر کے زمروں ہیں تقسیم کی جاتی ہیں لیکن تحلیلی زبانوں میں (islolation) کے عمل سے سرمایۂ الفاظ میں معتدبہ اضافہ ہوتا ہے۔ اول الزکر میں جملے میں استعمال ہونے والے کلمے کم ہوتے ہیں لیکن موخرالزکر میں زیادہ۔ ایک ہی زبان میں صورياتی یا صرفی کلمے islolation کے نتیجے میں حاصل ہونے والے کلموں سے بڑے ہوتے ہیں۔

کلمے کی صوتی خصوصیت اور کمیت خارجی عوامل سے متعین ہوتی ہیں اور ان عوامل کی تبدیلی کے مطابق بدلتی

رہتی ہیں لیکن صوتی تخفیف ایسی نہیں ہوتی کہ کلمہ ہی ناپید ہو جائے گویا کلمے کے وجود کے لئے آواز ناگزیر ہے خواہ وہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔ اس لئے ''معنویاتی کلمہ'' کی اصطلاح اسی وقت درست قرار دی جاسکتی ہے جب اس سے کلمے کی معنویاتی حیثیت مراد لی جائے۔

ایک طرف کلمے کی صوتی حیثیت اور خصوصیات ہی کے مطالعے کو اہمیت دی جاتی رہی ہے' تاریخی اور تقابلی لسانیات میں تو صوتی تغیرات کو صوتی قوانین کی روشنی میں رکھا جاتا رہا ہے اور اشتقاقیاتی مطالعے میں کلموں کے معانی کو نظر انداز کرکے محض اصوات اور ان کے تغیرات ہی کو پیش نظر رکھا گیا' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ''لسانیات'' زندگی اور اس کے مظاہر سے کٹ کر خشک اور بے جان ہوگئی۔ دوسری طرف ماہرین معنویات نے کلمے کی علامتی حیثیت اور اس کے صوتی پہلو کو بالکل نظر انداز کردیا اور معانی ومفاہیم ہی کو لسانی حقیقت قرار دینے لگے۔ اس طرح صوتی کلمے اور معنویاتی کلمے کی اصطلاحیں معرض وجود میں آگئیں لیکن ان اصطلاحات کی وجہ سے افراط وتفریط بھی ہونے لگی اور ماہرین لسانیات اور ماہرین نفسیات کی اس انتہا پسندی کے نتیجے میں لسانی مباحث میں الجھنیں بھی پیدا ہوگئیں

کلمے کی آواز اور مدلول میں کوئی منطقی رشتہ نہیں ہوتا۔ ایک ہی معنویاتی قدر کے سیاق میں مخصوص آواز کو سن کر' اسے اس معنویاتی قدر کی علامت سمجھا جانے لگا ہے۔ بسیط آوازیں اسی طرح معانی ومفاہیم سے آشنا ہوئیں اور انہیں سنتے ہی مدلول کی طرف ذہن مرکوز ہونے لگا۔ بعض لوگ تو

مفرد آوازوں کو بھی بعض دلالتوں سے مختص کر دیتے ہیں۔ مثلاً بھاڑ، بھٹی، بھڑک، بھڑکدار، بھڑکیلا، بھیم وغیرہ کے مفاہیم ہر سے قیاس کرکے ,, بھ ,, کو گرمی، تیزی، حدت وغیرہ کا مظہر بھی سمجھا جانے لگا۔ گھٹ، گھاٹی، گھونگھر، گھونگا، گھیر، گھیرا گھنڈی، گھولنا، گھرا، گھگی، گھونگھٹ، گھسنا وغیرہ کی اشتقاقیاتی چھان بین کے بجائے ,,گھ,, کی آواز کو نشیب، پیچیدگی، موڑ، رگڑ وغیرہ کی علامت بھی قرار دیا جانے لگا۔ حالاں کہ ,, بھ ,, اور ,, گھ ,, کی آوازوں کا ان مفاہیم سے کوئی منطقی رشتہ نہیں بن سکتا۔

بسیط آوازیں، بولنے والے کے مخصوص رویے کے سیاق میں ہوتی ہیں اور سننے والے میں کم و بیش ویسا ہی رویہ پیدا کر دیتی ہیں۔ یہ رویہ اظہاری بھی ہو سکتا ہے (مثلاً خوشی کا) اور ابلاغی بھی اور بیک وقت دونوں بھی۔ اگر ہم اپنا مطالعہ انفرادی کلموں تک محدود رکھیں تو بمشکل ایسی مثال ملے گی جس میں تمام تر مفہوم محض جذباتی ہو، ان کا کوئی نہ کوئی مدلول ضرور ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ جذبے کی رنگ آمیزی کی وجہ سے مدلول کی جیتی جاگتی حیثیت سامنے نہ آئے۔ چونکہ کلمے یا عمل کا اظہار کرنے والے قدیم ترین کلمے محض جذبات کے مظہر نہیں ہوتے بلکہ پورے پورے جملوں کے مفہوم پر دلالت کرتے ہیں اس لئے انھیں کلموں کے بجائے جملے کہنا مناسب ہوگا۔

جن دلالتوں کے سیاق میں بسیط آوازیں استعمال کی جاتی ہیں وہ تھوڑے سے تجربوں کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہیں اور زیادہ تجربوں کا بھی۔ تجربوں کے بعد نمایاں خصوصیات کے اشتراک کی بنیاد پر تجریہ

کی جاتی ہے۔ گویا کلمہ تجرید کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن تجرید سے معنی میں قطعیت پیدا نہیں ہوتی کیونکہ مدلول ہر چند محسوس اور مادی وحقیقی سہی، اس میں کچھ نہ کچھ تو کیفیت اور الجھاؤ ضرور ہوتا ہے اور تجرید میں الجھاؤ کم کرکے کسی قدر سادگی پیدا کی جاتی ہے۔ اسمائے خاص ایسی دلالتوں کے سیاق میں استعمال ہوتے میں جن کا دارومدار کم سے کم تجربے پر ہوتا ہے لیکن پھر بھی ان کے مفہوم میں وہ قطعیت نہیں ہوتی جو مدلول میں واقعی ہے۔ مثلاً ''نپولین'' محض ایک نام نہیں بلکہ ایک مخصوص شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور ایک لحاظ سے پیچیدہ مداول کی علامت ہے، جسے سن کر اس شخصیت کی کلیت واضع نہیں ہوتی۔ ''کلمہ اولاد'' میں تجرید پر غور کیجئے۔ اس کا مفہوم بیٹے بیٹیاں بھی ہوسکتا ہے اور پوتے پوتیاں بھی کلمہ ''مکان'' ایک مخصوص مکان، اس کی ساخت، ہئیت، وسعت، گنجائش، نقشہ وغیرہ کا تصور سامنے نہیں لاتا۔ بہت سے ''مکان'' دیکھ کر ان کی مشترکہ خصوصیات اخذ کر کے اور اختلافات کو نظر انداز کر کے تجرید کرلی جاتی ہے اسی لئے تجرید سے ابہام بھی پیدا ہوتا ہے اور کبھی کبھی کثرت معانی بھی۔ کلمہ ''wood'' انفرادی طور پر استعمال ہو تو اس سے مدلول کی قطعیت ذہن میں نہیں آتی اس سے لکڑی بھی مراد لی جاتی ہے اور جنگل بھی۔ لکڑی، درخت کی بھی ہو سکتی ہے، میز یا کرسی کی بھی۔ اس کی کوئی مخصوص ہئیت، جسامت، ٹائپ، قسم وغیرہ ذہن میں نہیں ابھرتی صرف اردو کلمہ ''برف'' کہا جائے تو ''ice'' اور ''Snow'' دونوں ذہن میں آسکتے ہیں۔ ابہام اور کثرت معانی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ کلمے کو استعارے کے طو پر استعمال کرکے

کوئی اور مفہوم بھی مراد لیا جائے۔

زبان میں نظم و ترتیب زبان ایک سماجی ادارہ بلکہ سماجی عمل ہے۔ اسی لئے لسانیات میں ان کلمات پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے جو واقعی بولے اور سنے جاتے ہیں اور ان کی صوتی حیثیت کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے لیکن اس کے نتیجے میں نظام لسان کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دی جاسکی۔ بول چال ایک نفسیاتی و عضویاتی عمل ہے اور زبان کا نظام بول چال سے مستنبط مواد کی نفسیاتی گروہ بندی کرتا ہے جو ذہن میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے بول چال کو نظام لسان پر تقدم حاصل ہے۔ اول الذکر کے بغیر موخر الذکر کا وجود یا ارتقا ممکن نہیں۔ لیکن ایک بار نظام وجود میں آجاتا ہے تو اسے اس بول چال سے ممتاز کیا جا سکتا ہے، جس کا وہ مرہون منت ہے اور پھر زبان کا پیدا کردہ نظام، زبان یا بول چال پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بول چال کسی نظام کے بغیر زبان کے درجے پر پہنچتی بھی نہیں نظام لسان ہی کی بدولت زبان میں استقلال اور نظم و ترتیب پیدا ہوتے ہیں۔ زبان سیال حالت میں ہو اور اس کے مختلف اجزا سانچوں میں نہ ڈھل سکے ہوں تو وہ مسلسل سماجی ابلاغ کا صحیح ذریعہ کیسے بن سکتی ہے۔ بول چال کے ان گنت تجربوں کے مشترک عناصر کی گروہ بندی اور زمروں میں تقسیم کر کے نظام لسان کے مختلف حصے مرتب کئے جاتے ہیں، یہ حصے زبان میں نظم و ترتیب پیدا کرنے کا ذریعہ بنائے جاتے ہیں اور ان کی رہ نمائی میں زبان کے سرمائے میں باقاعدہ اضافہ کیا جاتا ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود

نظام لسان کو زبان نہیں قرار دیا جاسکتا- بول چال کے سیاق ہنگامی اظہار وابلاغ کی غرض سے ترتیب پاتے ہیں جبکہ نظام لسان کے سیاق اور اجزا کا مقصد گروہی تقسیم' ترکیب اور جمع بندی ہے- یہ ضروری نہیں کہ محض نظام لسان کو سمجھ لینے کے بعد اس زبان کو سمجھا اور بولا بھی جاسکے-

ہر زبان کا ایک صوتی نظام ہوتا ہے' اس کے مخصوص مصوتے اور مصمتے ہوتے ہیں' ان کی ترکیب و تالیف کے مخصوص انداز ہوتے ہیں ان سے ہٹ کر کوئی نئی اور اجنبی آواز یا ترکیب و تالیف کا انداز' زبان میں شامل نہیں ہوتے- یہ اور بات ہے کہ اعضائے نطق کے اتفاقی غلط استعمال اور غلط مخرج کی وجہ سے کبھی اتفاقاً کوئی نئی آواز پیدا ہو جائے اور رفتہ رفتہ صوتی نظام کا حصہ بن جائے— یا اڑوس پڑوس کی زبانوں کے زیر اثر دخیل الفاظ کی بدولت آہستہ آہستہ نئی آواز صوتی نظام کا حصہ بن جائے- جیسے ''بڈا''اور ''گڈی'' سے ''بڑا'' اور ''گاڑی'' بن گئے-

معنویاتی صوتی تنظیم سے کلمات کی دو قسمیں نمایاں ہوتی ہیں- اول وہ کلمے جو بجائے خود مکمل ہیں' جنھیں مستقل کلمے کہا جا سکتا ہے- دوم وہ جو اضافی عناصر کی ترکیب سے وجود میں آتے ہیں- اول الذکر زبان کے اہم حصے ہوتے ہیں' جن کا اصل اور تعمیری عناصر میں تجزیہ کیا جا سکتا ہے اور جنھیں علاحدہ علاحدہ اصعرات میں تحلیل کیا جا سکتا ہے' موخرالذکر بھی اہم تو ہوتے ہیں لیکن انھیں صرف اصوات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے- صوریاتی اعتبار سے مرکب کلمے' زیادہ منظم ہوتے ہیں ان کے مستقل اور تعمیری اجزا سیاق کے لحاظ سے

الگ الگ کئے جاسکتے ہیں لیکن وہ اپنے صوتی اور دلالتی پہلوؤں سمیت، ساتھ ساتھ موجود رہتے ہیں۔

نظم و ترتیب کا عمل کلموں ہی پر نہیں ہوتا، جملوں پر بھی ہوتا ہے۔ بہت سے جملوں کے تجربوں سے مشترک خصوصیات اخذ کر کے ان کی گروہ بندی کر لی جاتی ہے کے لیکن بول چال کے ان گنت تجربے ہوتے ہیں ان کی نوعیتیں لاتعداد ہوتی ہیں اتنی کہ بہت سے عناصر چھوٹ بھی جاتے ہیں۔ مشترک عناصر اتنے عام اور مجرد ہوتے ہیں کہ ان کی گروہ بندی اور تنیظم میں خاصی دشواری بھی پیش آسکتی ہے۔ سیاق جملہ کے نظم و ترتیب کا دارومدار آواز، کی رفتار آہنگ کی سطح، نقرہ، زیروبم، آواز کی سکڑن، ترتیب، ترکیب وغیرہ پر ہوتا ہے۔ جملہ، کلمے کے مقابلے پر زیادہ آزاد ہوتا ہے اور بول چال کی اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔

عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ نظم وترتیب کے عناصر، قواعد دانوں کی تجرید کا نتیجہ ہوتے ہیں اور بول چال سے لگا نہیں کھاتے۔ یہ دعویٰ تو نہیں کیا جاسکتا کہ اصوات، صرفی عناصر، کلموں اور جملوں کے ان گنت اور پیچیدہ سیاقات، بولنے والوں کے ذہنوں میں شعوری طور پر موجود رہتے ہیں لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ نظم وترتیب کا کام غیر شعوری طور پر ہوتا رہتا ہے۔ کوئی بھی سیاق یا اس کا ایک جزو، دوسرے متعلقہ سیاق یا اس کے جزو کے التزام کی وجہ اُبھر آتا ہے۔ اگرچہ نظم وترتیب کے عناصر بول چال کے متعدد تجربوں کے مشترکہ خواص کی تجرید کا نتیجہ ہوتے ہیں، لیکن وہ محض مجردات نہیں سمجھے جا سکتے۔ نظم و ترتیب کے

تفصیلی مدارج کا اظہار عام لسانی بیوہار سے ہوتا رہتا ہے۔ زبان سیکھتا ہوا بچہ اپنی زبان کا نظام غیر شعوری طور پر بتدریج خود بناتا رہتا ہے اور اس کی لغزشوں سے اس کی تکمیل بچو کوشش کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ نظم و ترتیب اور باقاعدہ گروہ بندی کے بغیر لسانی مواد کو مخصوص متعینہ اور قطعی طور پر ترکیب دینا ممکن نہیں اور اس کے بغیر سماجی ابلاغ بھی دشوار ہے۔ قدیم ترین انسان بھی ایک اعتبار سے قواعددان سمجھے جاسکتے ہیں۔ وہ بول چال کے تجربوں سے مشترکہ خواص کی تجرید کرکے نظم و ترتیب کے قاعدوں کی رسمی تدوین تو نہیں کرتے تھے لیکن لسانی تنظیم کی روایت قائم کرنے اور اسے پروان چڑھانے کا حق ادا کرتے رہتے تھے۔

زبان میں نظم و ترتیب سے بحث کے دوران یہ سوال بھی ابھر سکتا ہے کہ آخر کلمہ کو جملے یا صرفی عناصر سے کس طر ممتاز کیا جا سکتا ہے۔ عام طور آواز کے با معنی مجموعے یا ترکیب کو کلمہ اور کلموں کے مجموعے یا ترکیب وترتیب' کو جملہ کہا جاتا ہے لیکن لسانیاتی نقطہ نظر سے یہ امتیاز کافی نہیں ہے۔ ایک کلمہ کے ایک سے زیادہ سیاقات' ایک سے زیادہ دلالتیں اور ایک سے زیادہ مدلول ہوسکتے ہیں۔ شاید حسب ذیل نقشے سے وضاحت ہوسکے۔
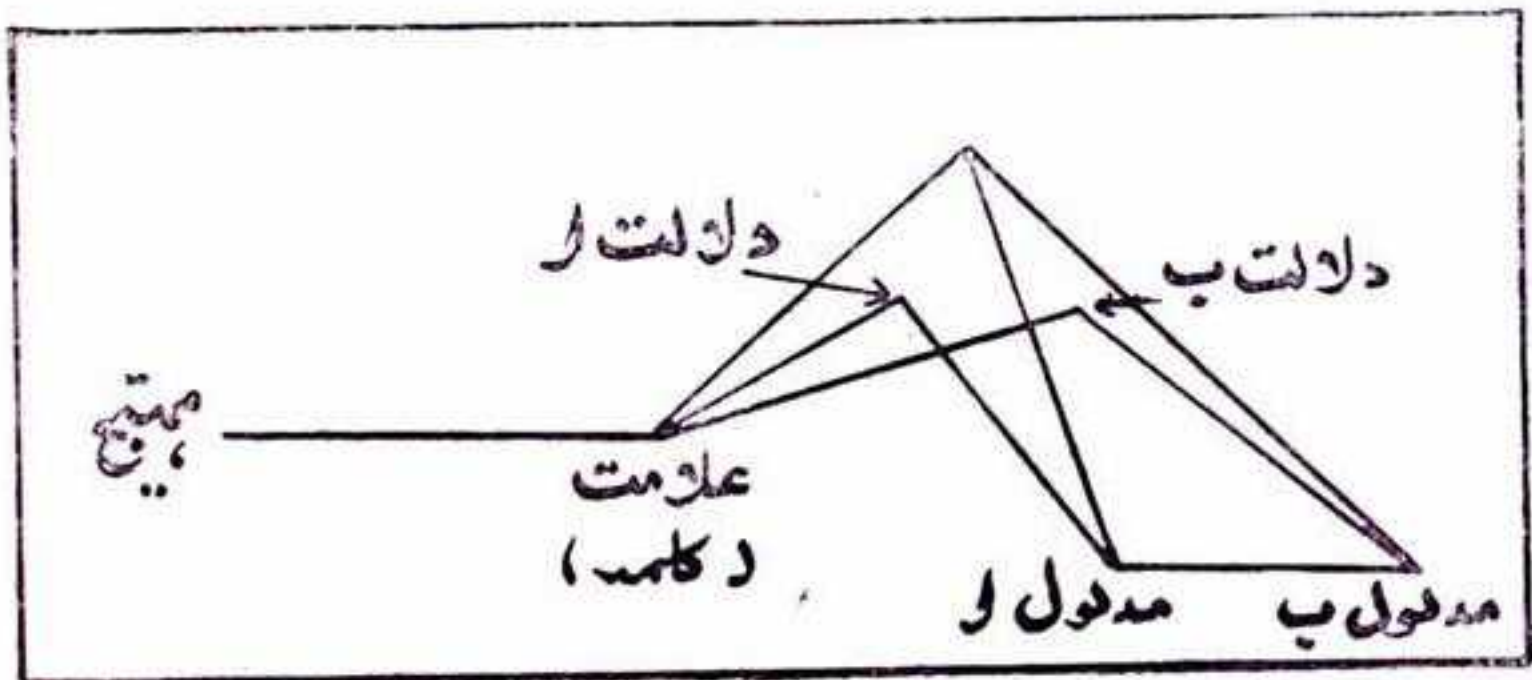
فرض کیجئے کلمہ ''برف'' ادا کیا گیا۔ اس سے دو دلالتیں ہوئیں اور دو مدلول ذہن میں ابھرے ایک ice اور دوسرا Snow۔ دونوں مدلول الگ الگ بھی ابھرتے ہیں' جیسا کہ دلالت ''ا'' مداول ''ا'' اور دلالت ''ب'' اور مدلول ''ب'' سے ظاہر کیا گیا ہے' دونوں دلالتیں ہیک وقت بھی سامنے آتی ہیں جیسا کہ دلالت ''اب'' سے ظاہر ہے۔

جملے کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے :-

مندرجہ بالا شکلوں سے واضح ہے کہ کلمے کی دلالت اور اس کے مدلول میں قطعیت نہیں ہوتی جبکہ جملے کی دلالت اور اس کے مدلول میں قطعیت ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھار جملہ بھی مبہم ہو سکتا ہے۔ انفرادی کلمے کی صورت میں علامت اور اس کی مختلف دلالتیں پہلے سے متعینہ ہوتی ہیں' اور ان میں سے کوئی ایک متکلم کے ذہن میں شعوری طور پر اُبھرتی ہے لیکن سامع کے ذہن میں اس کے ساتھ ساتھ دوسری دلالتیں بھی اُبھرسکتی ہیں۔ لیکن جملہ ادا کرتے وقت متکلم کے شعور میں جو قطعی دلالت ہوتی ہے'
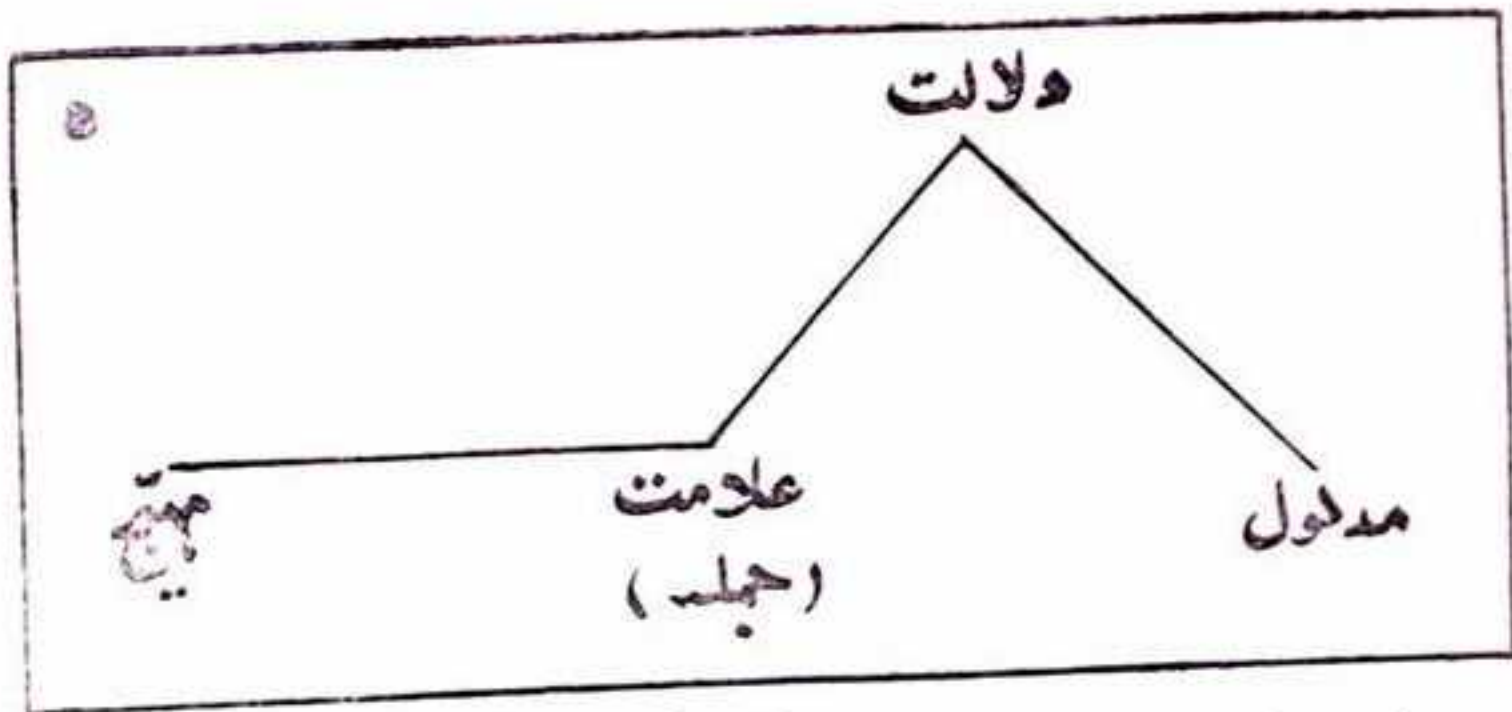
دوسرے کلمات اور ان کے سیاقات کی وجہ سے سامع کے ذہن میں بھی وہی ابھرتی ہے۔ کلمہ ادا کیا جائے یا نہ ادا کیا جائے اس زبان کے بولنے والوں کے حافظے میں اس کی تمام دلالتیں موجود ہوتی ہیں۔ کلمے کے سیاقات مختلف ہوسکتے ہیں، واضع بھی ہو سکتے ہیں اور مبہم بھی۔ موزوں بھی ہوسکتے ہیں اور کسی قدر غیر موزوں بھی، لیکن بنیادی خصائص کے اعتبار سے ایک سے ہوتے ہیں جملے کی دلالت متکلم اور سامع تک محدود ہوتی ہے (لکھے ہوئے جملے کی دلالت لکھنے والے اور پڑھنے والے تک محدود ہوتی ہے)۔ منہ سے نکلا ہوا انفرادی کلمہ محض ایک اشاراتی بول کہلا سکتا ہے، جس سے کسی مخصوص جذبہ کا اظہار یا کسی خصوصی دلالت کا ابلاغ نہیں ہوتا لیکن جملہ بنیادی طور پر جذبات کا اظہار یا دلالت کا ابلاغ کرتا ہے۔ انفرادی کلمے سے بنیادی طور پر متکلم کے رویے، اس کے جذبات یا خواہشات کا اظہار ممکن ہی نہیں۔ ہاں فجائیہ کلموں سے جذبات کا اظہار ضرور ہوتا ہے لیکن انہیں بجائے کلموں کے جملے کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ لیکن اگر انہی فجائیہ کلموں کی ادائیگی کا فجائیہ عنصر یا لہجہ ختم ہوجائے تو پھر وہ عام کلمے رہ جائیں گے۔

مندرجہ بالا نقشوں کی سطحی تفسیر سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ ایک انفرادی کلمہ، کچھ جملوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ انفرادی کلمہ بہت سے جملوں کا مبتدا ہو سکتا ہے، جن میں سے ہر ایک میں انفرادی کلمے میں مرموز ہونے والے عام یا مخصوص سیاقت یا دلالتوں میں سے کوئی ایک ''خبر'' کی حیثیت رکھ سکتی ہے۔ مثلاً لکڑی

ایک مادہ ہے۔" "عمارتی کاموں میں استعمال ہونے والی لکڑی ٹمبر کہلاتی ہے" "لکڑی گیلی نہیں ہے" وغیرہ میں لکڑی، مبتدا ہے اور مختلف "خبر" کے ساتھ اس کا ذکر ہے۔ ان میں سے ہر ایک جملے میں علامت لکڑی کی دلالت کی تخصیص جملے کے سیاق سے ہوتی ہے لیکن انفرادی کلمہ "لکڑی" کہنے سے ایسی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ انفرادی کلمہ بہت سی دلالتوں کے سیاق میں ہوتا ہے اور مرموز ہونے والی تمام مخصوص دلالتوں کے کچھ مشترک خصائص ہوتے ہیں جو کلمے کی تجرید کی ہوئی مشترک دلالت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مندرجۂ بالا پہلی شکل میں دلالت "اب" سے اس کی وضاحت ہو سکتی ہے۔ جب کبھی، کسی جملے کے سیاق میں کوئی علامت کسی مخصوص دلالت سے متعلق ہوتی ہے تو دلالت کسی نہ کسی طرح انفرادی کلمے کی علامت کی تعمیم شدہ عام دلالت سے وابستہ ضرور سمجھی جاتی ہے۔

یہ سوال کہ آخر کسی جملے کے مواد کا ایک حصہ بن کر کلمہ کیا بن جاتا ہے، خاصا دلچسپ ہے اور اس کے جواب سے کلمے کی ماہئیت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم بول چال میں کلمے استعمال کرتے ہیں اور جملہ بول چال کی حقیقی اور بنیادی اکائی ہے نیز یہ کہ ہم محض کلموں کو پہلو بہ پہلو رکھ کر یا ساتھ ساتھ بول کر جملے نہیں بناتے۔ ہم پہلے بھی یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ قدیم ترین کلمہ بول چال کے جملے سے مستنبط ہوا ہے۔ ایک بار اس کی سیاقی حیثیت ممتاز ہوگئی تو اس سے ملتے جلتے سیاق گفتگو میں بھی استعمال ہونے لگا اور اسے ایسی معروضی حیثیت بھی دی جانے

لگی کہ بول چال سے ہٹ کر بھی ترکیب دیا جا سکے۔ اکثر زبانوں کی مسلسل بول چال میں کلمے اپنی مکمل اکائی برقرار نہیں رکھ سکتے۔ مثلاً انگریزی جملہ ''I have not Seen her'' جب آج کل بولا جاتا ہے تو اس کا ہر کلمہ اس طرح نہیں سنائی دیتا جس طرح انفرادی کلمے کی حیثیت سے ادا کرنے وقت سنائی دیتا ہے۔ تامل فقرے ''مرتنَ کپوگل'' (درخت کی شاخیں) میں کلموں کی اصل صوتی حیثیت نہیں ابھرتی۔ مرم (درخت) صرف ''مر'' رہ جاتا ہے۔ اس مثال کا تجزیہ یوں ہو سکتا ہے۔

مرم + اتو + ان + (الف قصیر) + کپو + گل — اتو اور ان اضافیے صوتی ہمواری اور ہم آہنگی کا نتیجہ ہیں اور علامت اضافت ''ا'' قصیر (یا زبر) نےَ ''مرتینَ'' کو جنم دیا۔ اضافیوں کی آخری آواز ''ن'' نے علامتِ اضافت زبر یا الف قصیر کے ساتھ مل کر ''نا'' کا آہنگ پیدا کیا تو ''نا'' کو علامتِ اضافت سمجھا جانے لگا۔

اس قسم کی مثالیں اکثر زبانوں میں ملتی ہیں۔ بلوچی میں مرکب دست رس کو دسرس کہا جاتا ہے۔ گویا مرکب کا پہلا جزو اپنی اصل صوتی حیثیت کو برقرار نہیں رکھتا۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جملے کے اندر مواد کے حصے کی حیثیت سے استعمال ہونے والا کلمہ جملے سے باہر ہی اپنی اصل صوتی حیثیت کا مظہر ہوتا ہے۔ جن زبانوں کی بول چال میں کلموں کا باہمی صوتی انضمام و ادغام کم ہوتا ہے اور لہجہ یا نقرہ کلموں کی صوتی حیثیت کو مسخ نہیں کرتا یا

کرتا ہے تو برائے نام، تو ان کی بول چال میں کلاوں کی صوتی حیثیت عموماً برقرار رہ جاتی ہے- اردو بول چال کو مثلاً پیش کیا جا سکتا ہے ہاں، اسمائے مانعہ محرف حالت میں صوتی اعتبار سے تبدیل ضرور ہو جاتے ہیں۔ مثلاً لڑکے نے کتاب پڑھی-، ''لڑکوں نے کتابیں خریدیں''- وغیرہ میں لڑکا اور لڑکے کی محرف صورت ''لڑکے'' اور لڑکوں'' ہوگئی۔

جملے اور کلمے کے تقاضوں کے جائزے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کلموں کی تین نوعیتیں ہوتی ہیں (۱) سادہ یا مفرد کلمے - جو صوتی معنویاتی عناصر کی نا قابل تجزیہ ترکیب سے وجود میں آئے ہیں (۲) صرفی کلمے، جنھیں بولنے والے دو ایسے صوتی معنویاتی اجزا سے ترکیب پایا ہوا سمجھتے ہیں جن میں سے ایک کسی منظم ساخت کے بغیر جملے کا مواد نہیں بن سکتا (۳) مرکب کلمے، جنھیں بولنے والے ایسے مفرد اور صرفی کلموں کی ترکیب کا نتیجہ قرار دیتے ہوں، جن کے صوتی عناصر کسی منظم اور ڈھلے ڈھلائے سانچے کی رو سے ترکیب دیئے گئے ہوں، جن میں سے ہر ایک کی دلالت اور سیاق دوسرے کی دلالت اور سیاق سے میل کھاتے ہوں —

کبھی کبھی مرکبات بھی بتدریج سادہ، اور مفرد کلموں کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں انگریزی مرکب Break fast کو بطور فعل استعمال کیا جاتا ہے تو اس کی گردان breaks fast اور broke fost کے بجائے break fasts اور break fasted کی جاتی ہے - Husband کو سادہ اور مفرد

سمجھ لیا جاتا ہے اور یہ بھلا دیا جاتا ہے کہ اینگلو سیکسن اور وسطی انگریزی میں husbonde ‘husbonda (گھر یا خاندان کا مالک) تھا۔

کلموں کی یہ تمام قسمیں دراصل جملوں کے نحوی ٹکڑے ہیں جنھیں آزاد مظاہر، محاوروں، مرکبات اور مفرد کلموں کی حیثیت سے الگ کر لیا گیا ہے۔ ان جملوں کے قیاس تمثیلی ہم متوازی جملے وجود میں آتے رہے اور جب ان سے استنباط کر کے کلموں کی حیثیت میں تجزیہ کیا گیا تو ان کلموں کو ایک طرح کے نمونے کی حیثیت حاصل ہوگئی اور پھر ان کی تشکیل کے قاعدے ترتیب دے لئے گئے ان قاعدوں کی پیروی کر کے مزید کلمے تشکیل کئے گئے۔

مرکبات کی قسمیں دنیا کی مختلف زبانوں میں مرکبات کی جو نوعیتیں ہیں، ان سب کا احاطہ کرنا دشوار ہے۔ صرف اہم نوعیتوں کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی درجہ بندی کا ایک اصول اس طریقے پر مبنی ہو سکتا ہے جس کے تحت اجزائے ترکیبی صوتی لحاظ سے جوڑے جاتے ہیں۔ یہ اجزائے ترکیبی ایک ہی نوعیت یا ہم تعلق سیاق کے یا بظاہر بے تعلق مستقل کلمے بھی ہو سکتے ہیں۔ اجزائے ترکیبی کے نحوی رشتوں کی رو سے مرکبات کی یہ قسمیں کی جا سکتی ہیں :-

(۱) مرکب مترادفی۔ دو مترادفات کو پاس پاس رکھ کر جو مرکب بنایا جائے اسے مرکب مترادفی کہتے ہیں مثلاً رینڈئیر (Reindeer)- اسکنیڈی نیویا کی زبان میں Reen

کے معنی خود رینڈئیر ایک قسم کے ہرن کے ہوتے ہیں
welfest (وہیل) حالاں کہ wel کے معنی ہیں ''وہیل'' -
بھول چوک - دیکھ بھال، اچھل کود- بھولا بھٹکا -
پکڑ دھکڑ

(۲) مرکب عطفی ۔ دونوں کلموں کا درمیانی - حرف عطف
گرا کر یہ مرکب بنایا جاتا ہے -

(ا) دونوں کلمے معنی کے اعتبار سے مختلف ہوں لیکن بالکل
بے تعلق نہ ہوں مثلاً ماں باپ - دل گردہ۔ دن رات۔
کام دھام - لال پیلا- تانا بانا وغیرہ۔

(ب) دونوں کلمے فعل ہوں یا فعل کے مشتقات مثلاً پڑھا لکھا
توڑ جوڑ - ہارجیت۔ اُدھیڑ بن ۔ وغیرہ ۔

(ج) کبھی کبھی دونوں کلموں کے درمیان الف کی آواز بھی
آجاتی ہے دھکا پیل۔ دھینگا مشتی - بیچا بیچ -

(د) کلمے کی تکرار سے بھی عطفی معنی پیدا کئے جاتے ہیں
اور درمیان میں عطف کی کمی کسی اور آواز سے پوری
کی جاتی ہے- مثلاً شبا شب - دربدر -

(۳) مرکب نحوی ۔ کلموں میں حسب ذیل نحوی رشتے ہو
سکتے ہیں -

(ا) اضافی - ایک جزو مضاف اور دوسرا مضاف الیہ - بن چکی
(پانی کی چکی) - باگ ڈور (باگ کی ڈور) - پن گھٹ
(پانی کا گھاٹ)- پانی مخفف ہو کر ''پن'' رہ گیا ہے-

عربی کے مرکبات اضافی میں مضاف پہلے اور مضاف الیہ بعد میں آتا ہے - اردو میں عربی کے بعض اضافی مرکبات عام طور پر استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً بیت المال - بیت الخلا - ابن الوقت - دارلحکومت۔ دار الکافات ۔ راس المال واجب الادا- فارسی کے مرکباتِ اضافی کی بھی یہی کیفیت ہے مثلاً ارباب دولت - قابل داد بزم سخن۔ لائق تحسین وغیرہ- مرکب اضافی کی ایک صورت یہ ہے کہ کسرہ اضافی اڑ جاتا ہے مثلاً اہل کار- صاحب دل - میر مجلس' صاحب اقبال اور یائے نسبتی مصدری بڑھا کر نئے مرکبات بھی بنالئے جاتے ہیں مثلاً اہل کاری - صاحب تمیزی- صاحبدلی- مرکب اضافی کے اجزا کی ترتیب بھی بدل جاتی ہے اور کسرہ اضافی بھی نہیں رہتا- مثلاً دست پناہ - شہر یار - شب کور- زہر مہرہ- شہر پناہ - گاؤ زبان- عنایت نامہ -

(ب) مرکبِ توصیفی- فارسی کے مرکبِ توصیفی میں موصوف پہلے صفت بعد میں آتی ہے اور موصوف کے آخر میں کسرہ توصیفی ہوتا ہے- مثلاً ریگِ رواں- ذہن رسا۔ منظر عام- وغیرہ- یا پہلا جزو مشبہ بہِ اور دوسرا مشبہ ہوتا ہے اور مرکب ایک' صفت بن جاتا ہے - مثلاً آہو چشم - سروقد- آتش زباں- شمع رو وغیرہ- یا پہلا جزو صفت ہوتا ہے اور دوسرا موصوف' اور دونوں مل کر ایک صفت بن جاتے ہیں مثلاً نیک بخت- خوبصورت عالی نسب بلند پرواز- عالی ظرف- بلند ہمت- نازک مزاج- یا پہلا جزو ہوتا تو اسم ہے لیکن معنی صفت کے لئے جاتے ہیں

اور دوسرے جزو موصوف کے ساتھ مل کر اور صفت' کے معنی دیتا ہے مثلاً مرزا منش ۔سلمان صورت ۔ کافر ماجرا ۔ ارسطو دانش وغیرہ— اردو اضافی' مرکب میں صفت کی علامت بڑھا کر صفت بنا لیتے ہیں مثلاً من موجی لکھ پتی وغیرہ ۔ اردو میں مرکبِ توصیفی کے اجزا فارسی کے مرکبِ توصیفی کے بر عکس ہوتے ہیں مثلاً کچالو — اندھیر کھاتا — وغیرہ ۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم نے ایک قسم مرکب وصفی بتا کر اسے مرکبِ توصیفی سے ممتاز کیا ہے اور یہ مثالیں دی ہیں — ادھ موا— بڑ بولا— منہ پھٹ — ہتھ چھٹ ۔ من چلا وغیرہ

(چ) مرکب فاعلی ۔ اردو میں اسم اور امر مل کر اسم فاعل ترکیبی کا کام دیتے ہیں ۔ مثلاً چڑی مار ۔ مکھی چوس۔ نیبو نچوڑ۔

(د) مجروری ۔ مثلاً دسیں نکالا ۔ منہ بولا ۔ رس بھری۔ آنکھوں دیکھا۔ اجزا کے درمیان سے حرف جر ''سے'' محذوف ہو جاتا ہے —

(ہ) مفعولی ۔ مثلاً انگرکھا (انگ رکھا)

(و) ظرفی۔ مثلاً بھڑ بھوجا

(ز) عددی ۔ مثلاً دوپہر' دوراہا' چوراہا وغیرہ ۔

ان کے علاوہ اسموں اور امر' اسموں اور ماضی' اسموں

اور مفعول کے مرکبات بھی بتائے جاتے ہیں ۔مثلاً دل آزا خوش خرام - پامال نگہداشت دست برد - ستم رسیدہ غم زدہ اجل گرفتہ وغیرہ - دو حاصل مصدروں کو ملا کر مرکب حاصل مصدر بھی بنایا جاتا ہے مثلاً دوڑ دھوپ - لاگ لپٹ - پکڑ دھکڑ وغیرہ

(۴) مشتق مرکبات - ایسے مرکبات جن میں اشتقاق کی کارفرمائی بھی ہوتی ہے - یہ در اصل مشتقات کے مرکب ہوتے ہیں، دونوں جزو مشتق ہوں یا ایک - مثلاً پن گھٹ (پانی گھاٹ) نکیل (ناک کیل) کھٹمل (کھا + شمل) چپراسی (چپ + راست + ی) انگوچھا (انگ + پونچھ)

مشتقات - مشتقات کو صرفی یا تالیفی کلمے (morphological words) بھی کہتے ہیں - مشتق سے مراد وہ کلمہ ہے جسے ایسے صوتی معنویاتی عناصر کی تالیف کا نتیجہ سمجھا جائے، جن میں سے ایک اصل یا مستقل کلمہ نہ ہو اور جو مزید باقاعدہ ساخت کے بغیر جملے کے مواد کا حصہ نہ بن سکے - نظریاتی طور پر اسے مرکب اور مفرد کلموں سے اسی طرح ممتاز کیا جاتا ہے لیکن زبان کی ارتقائی خصوصیت کی وجہ سے کلموں کی ان تینوں قسموں کے درمیان عملاً حدِ فاصل قائم کرنا دشوار ہوجاتا ہے - مرکبات میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے ایک یا دونوں جزو، کچھ تبدیلیوں کے بغیر جملے کے مواد نہیں بن سکتے - اگر یہ تبدیلیاں محض صوتی کاٹ چھانٹ یا ترمیم کا نتیجہ ہوں تو معنویاتی صوتیاتی ساخت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - مثلاً ''کھٹ مل'' میں پہلے جزو ''کھٹ'' کو جملے کا مواد بنانے کے لئے ''کھاٹ'' ہی کہنا

ہوگا لیکن اس سے کوئی معنویاتی توسیع نہیں ہوتی۔ صوتی نقطہ نظر سے اصل اور تعمیری کلمے میں امتیاز نہیں کیا جاسکتا، کسوٹی صرف معنویاتی ہوسکتی ہے۔ تعمیری کلمے کی مرموزی خصوصیات متنوع ہوسکتی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں اصل کلمے میں ایک یا زائد آوازوں کے اضافے سے پیدا ہوتی ہے۔ اکثر زبانوں میں (خصوصاً ہند یوروپی میں) یہ آوازیں یا اجزا کلمے کے شروع یا آخر میں بڑھائے جاتے ہیں اور علی الترتیب سابقے اور لاحقے کہلاتے ہیں اور ان سے اصل کلمے کے معنی میں تبدیلی پیدا کی جاتی ہے۔ یہ عموماً زبان میں مستقل حیثیت میں استعمال نہیں ہوتے۔ ایک ہی کلمے میں بیک وقت سابقے اور لاحقے دونوں کو بڑھایا جاسکتا ہے، دو دو لاحقے بھی لگائے جاسکتے ہیں اس طرح ایک ہی کلمے سے کئی نئے کلمے مشتق کرلئے جاتے ہیں مثلاً پرہیز سے پرہیز گار۔ نا پرہیز گار۔ نا پرہیزگاری بد پرہیز۔ بد پرہیزی۔ بعض زبانوں میں فعل کی گردان شخصی لاحقوں یا سابقوں سے کی جاتی ہے۔ مثلاً فارسی میں کردم۔ کردیم۔ کردی۔ کردید۔ کردند وغیرہ میں شخصی لاحقوں نے معانی کی توسیع کی اور فاعل کی وضاحت۔ Iroquis زبان میں بھی کام سابقوں سے لیا جاتا ہے۔

بعض زبانوں میں اصل کلمے کے اندر ایک یا زائد آوازیں بڑھا دی جاتی ہیں لیکن یہ بھی کلمے کی محض صوتی تبدیلی نہیں بلکہ معنویاتی بھی ہوتی ہے۔ اس طرح کی آوازیں غنہ (انفی) یا مکررہ (Liquid) ہوتی ہیں۔ مثلاً لاطینی vi-n-co vi-n-cebam میں n کی آواز معنویاتی طور پر vici اور vicissem سے ممتاز کرتی ہے۔ Mon-Khmer زبان میں

اندرونی "n" کے اضافے سے اسم آلہ اور اسم صفت بنائے جاتے ، ہیں انڈونیشی زبان میں اندرونی um سے فعل معروف اور اندرونی "in" سے فعل مجہول کے معانی پیدا ہوتے ہیں -

بعض زبانوں خصوصاً سامی زبانوں میں اندرونی اضافہ یا تبدیلی مصمتوں کی نہیں مصوتوں کی ہوتی ہے- انگریزی میں sung, sang, song, 'find, found 'come- came sing. وغیرہ کی مثال دی جاسکتی ہے- سامی زبانوں میں سہ حرفی مادے میں مصوتوں کی تبدیلیوں سے متعدد مشتقات بنائے جاتے ہیں- (ک ت ب سے کتب- کتب- کتاب - کاتب، کتابت وغیرہ

کچھ زبانوں میں کلموں کی صوتی تکرار سے معنویاتی توسیع کی جاتی ہے .مثلاً ملائیشیا کی زبان میں orang (انسان) سے orang orang (بہت سے انسان) جاپانی میں tabi (وقت) سے tabitabi (اکثر)- tokoro (جگہ) سے tokro takro جگہیں). اردو میں دریا سے دریا دریا (بہت سے دریا)- صحرا سے صحرا صحرا (بہت سے صحرا)- گویا جمع کا مفہوم پیدا کر دیا جاتا ہے- کبھی تکرار سے معنی میں شدت پیدا کی جاتی ہے اور مشتق سے نیا مفہوم مراد لیا جاتا ہے .مثلاً قدیم جاوائی زبان میں angin (ہوا) سے angin-angin (طوفان) -

کلموں کی تکرار سے نئے معانی بھی پیدا کئے جاتے ہیں- با، ما، دا وغیرہ کی تکرار سے بابا، ماما، دادا وغیرہ -

لہجہ بھی اصل کلمے کے سیاق و دلالت میں اضافے کا پہلو پیدا کر سکتا ہے- مثلاً انگریزی میں produce کے o پر زور

ہو تو اسم ہو جائے گا' u پر ہو تو مصدر۔ extract کے a پر ہو تو مصدر e پر ہو تو اسم۔ بعض زبانوں میں آہنگ اور زور و بم سے معانی خاصے بدل جاتے ہیں۔

دنیا کی تمام زبانیں ترکیب و تالیف کی اپنی خصوصیات رکھتی ہیں، ان میں سے بعض مشترک ہو سکتی ہیں۔ یہ اشتراک لسانی زمروں، گروہوں اور خاندانوں کے اعتبار سے زیادہ ہوتا ہے، اس کا سبب مشترک ورثہ بھی ہو سکتا ہے اور متوازی کوائف بھی۔ گرین لینڈ کی زبان، بنیادی طور پر ترکیبی ہے اور اس میں بڑے پیچیدہ کلمے تشکیل پاتے رہے ہیں لیکن اصل کلموں اور سابقوں اور لاحقوں کی مدد سے۔ جرمن اور ڈچ زبانوں میں مرکبات بنانے کی صلاحیت انگریزی سے زیادہ ہے۔ بعض زبانوں میں ترکیب کا عمل ہر قسم کے مستقل کلموں پر ہوسکتا ہے، بعض میں کلموں کی مخصوص قسموں ہی پر۔

مشتقات کے ذیل میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایک ہی زبان میں اخذ و اشتقاق کے مختلف ہی نہیں بلکہ متضاد طریقے بھی کار فرما ہوسکتے ہیں۔ مستقل یا اصل کلموں میں صوتی اضافوں یا سابقوں اور لاحقوں کی مدد سے نئے کلموں کی تشکیل کے ساتھ ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مفرد یا مستقل کلمے کو تالیف شدہ سمجھ کر اس میں سے ایسی اصوات کو، جو بہ ظاہر مضاعف محسوس ہوتی ہوں حذف کردیا جائے اور نئے کلمے بنائے جائیں۔ امریکی ماہر لسانیات سیمیون پاٹر (Semeon Potter) نے کلماتی تشکیل کے اس طریقے کو back-formation کہا ہے اور رجعتی اور منفی اخذ و اشتقاق

سے تعبیر کیا ہے مثلاً انگریزی فعل grovel نتیجہ ہے grovelling کے رجعتی اور منفی اشتقاق کا۔ غالباً اس کلمے کے اختتامی "ing" کو حالیہ کی علامت سمجھ کر اسے اسم حالیہ فرض کر لیا گیا اور اس علامت کو حذف کر کے ,,grovel,, وضع کر لیا گیا۔ اسی طرح "edit" صرف کھیے دیتا ہے کہ اسے "editor" سے اخذ کیا گیا ہے۔ "van" نتیجہ ہے "caravan" کی خوشہ چینی کا۔ غور تو کیجئے partake' greed' difficult' کہیں partaker' greedy' difficulty' کے دامن سے تو نہیں نکلے۔ موٹر کار سے جانے کے لئے ایک مخفف "Mote" وضع کیا گیا اور پھر اس سے motel (وہ ہوٹل جس میں موٹر سے آنے والے سیاح ٹھہریں) وجود میں آیا۔

آزاد اور مستقل کلموں کے باہمی امتزاج کی آنکھ مچولی نت نئے کلموں کو جنم دیتی ہے۔ امتزاج کا کوئی کلیہ قاعدہ تو نہیں ہوتا لیکن اس کے طفیل زبان کے سرمائے اور اس کی توانائی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ clang اور crash نے clash کو جنم دیا۔ fluster اور hurry نے furry کو۔ "یوریشیا" غماز ہے یورپ اور ایشیا کے امتزاج کا۔ ٹیلی کاسٹ ترجمان ہے televised براڈ کاسٹ کا۔ "پھلیل" اور "گڑا کو" میں پھول تیل۔ گڑ تمبا کو شامل ہیں۔ کلمے کے ابتدائی سلیبل پر زور نہ پڑتا ہو تو وہ کبھی کبھی حذف ہو جاتا ہے اور نیا کلمہ وجود میں رہتا ہے مثلاً defence کے ابتدائی سلیبل پر زور نہیں ہوتا تو اس کے سقوط سے "fence" جنم لیتا ہے۔ کلمہ "ڈرائنگ روم" عام طور پر استعمال ہوتا ہے لیکن بہت کم لوگوں نے یہ سوچا ہوگا کہ یہ کرشمہ ہے withdrawing کے ابتدائی سلیبل کے

سقوط کا - stain ،sport ،lone ،(زندہ) live ،spy ply ،peal
عام کلمے ہیں اور بلا تکلف بول چال میں استعمال ہوتے رہتے ہیں
غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب espy ،apply ،appeal،
کے distain ،disport ،alone ،alive ابتدائی سلیبل کے گرنے
سے وجود میں آئے ہیں -

دلالت کی اکائیوں کی تشکیل، ان کی معنویاتی توسیع،
نت نئی دلالتوں کی علامات کا اخذ و اشتقاق غیر شعوری طور پر
بھی ہوتا رہا ہے اور شعوری اور ارادی طور پر بھی کلموں کے
متوازی نمونوں سے مستنبط قاعدوں کو پیش نظر رکھ کر بھی
کلمے واضع کئے جاتے رہے میں اور قیاس تمثیلی بھی لسانی اضافے
کا سبب بنتا رہا ہے - عوام کالانعام نے آن گنت کلموں کو فوری
ضرورت اور سماجی تقاضوں کے ماتحت اضطراری طور پر جنم دیا
ہے اور عالموں نے ارادی تشکیل بھی کی ہے - مادی تجربوں کی
صوتی تجرید سے علامتیں وجود میں آئیں اور آہستہ آہستہ
زبان کی تجریدی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا رہا اس کے ساتھ ساتھ
اکثر زبانوں کا ترکیبی رجحان بدلنے لگا اور تحلیل کا انداز
بھی پیدا ہونے لگا - بعض زبانوں میں تحلیلی رجحان غالب آتا گیا -
اور زبانیں ارتقا کی منزلیں طے کرتی رہیں - بول چال کی معروضی
صوتی اور سمعی حیثیت بھی بدلتی رہی اور اس کے مواد، مفاہیم
اور دلالتوں میں بھی توسیع ہوتی رہی - صوتی تغیرات میں جہاں
ایک طرف صوتی اضافے، صوتی ارتباط، امتزاج، ادغام، انضمام
وغیرہ سے تالیف کی نت نئی صورتیں پیدا ہوتی گئیں اور ترکیب
کی نوبنوئیتیں وجود میں آتی گئیں، وہاں دوسری طرف صوتی

نحت و تخریب، حذف و سقوط سے نت نئے کلمے بھی پیدا ہوتے رہے - بعض کلمے امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ متروک بھی ہوتے گئے، کچھ نے زندہ رہنے کے لئے ذیلی اور اضافی حیثیت بھی حاصل کرلی مثلاً کلاسیکی لاحقے اگر چہ اپنی اصل حیثیت کھو چکے ہیں لیکن لاحقوں کی حیثیت سے مختلف زبانوں کے زندہ اجزا کی حیثیت بھی اختیار کر چکے ہیں -

جب یہ کہا جاتا ہے کہ زبانیں پیدا ہوتی ہیں ارتقا پاتی ہیں اور مر جاتی ہیں تو اس سے یہ مراد لیا جاتا ہے کہ زبانیں آہستہ آہستہ نمو پذیر ہو کر سیال حالت سے نظم و ترتیب کی طرف سفر کرتی ہیں، ان کے سرمائے اور توانائی میں اضافہ ہوتا ہے، ادبی و علمی حیثیت حاصل کرتی ہیں اور پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض بدلتی ہوئی زندگی سے کٹ کر رہ جاتی ہیں اور آہستہ آہستہ ان کا چلن ختم ہو جاتا ہے لیکن کچھ ترقی یافتہ زبانوں کے بعض عناصر اتنے جاندار ہوتے ہیں کہ ان زبانوں کے مروج نہ ہنے کے باوجود، زندہ رہتے ہیں اور دوسری زبانوں میں راہ پاکر زندہ جاوید بھی ہو جاتے ہیں یونانی اور لاطینی کے بہت سے کلمے اپنی اصل حالت میں یا معمولی تغیرات کے ساتھ یا سابقوں اور لاحقوں کی حیثیت سے آج بھی بہت سی مغربی زبانوں میں زندہ ہیں - اسی طرح سنسکرت کے بہت سے کلمے اپنی اصل حالات میں (تت سم) اور بہت سے صورت شکل بدل کر (تدبھو) جدید ہند آریائی زبانوں میں اب بھی مستعمل ہیں -

لسانی تغیرات اور ان کے اسباب

ہم سب جانتے ہیں کہ زبانیں ادلتی بدلتی رہی ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ نئے روپ بھی دھارتی رہی ہیں ان کے باہمی تال میل سے ایسی زبانیں بھی جنم لیتی رہی ہیں جنھیں ممتاز کرنے کے لئے نئے ناموں سے بھی موسوم کیا گیا ہے اور پھر وہ اپنے مزاج، اور ڈھانچے کے اعتبار سے واقعی نئی زبانوں کی حیثیت بھی حاصل کر گئیں۔ لیکن لسانی تغیرات کا شعور، زبان کے عام بولنے والوں کو نہیں ہوتا۔ عام بول چال کے دوران مواد یا مفہوم پر توجہ دی جاتی ہے، انداز گفتگو پر نہیں، یا برائے نام توجہ ہوتی ہے۔ جب تک گفتگو میں مسلمات سے بہت زیادہ غیر معمولی انحراف نہیں ہوتا، تغیرات کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ کلموں تلفظ لہجے، کلموں کی ترتیب وغیرہ کا جو تصور ذہن میں ہوتا ہے، اس کی حدود سے بہت زیادہ تجاوز کیا جاتا ہے تو سننے والا کچھ چونکتا ہے، ورنہ معمولی انحرافات یا تبدیلیوں کو یکسر نظر انداز کر دیتا ہے۔ بولنے والے کو طور عام پر خود بھی یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ اس نے مسلمات سے انحراف کیا ہے۔ ہر شخص اپنی بول چال میں کچھ نہ کچھ انحراف ضرور کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ بولنے والا

جاتی ہے اس کی توانائی اور صلاحیتوں میں اضافہ نہیں ہوتا اور آہستہ آہستہ وہ زندہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں رہ جاتی۔ سنسکرت کے فروغ کو ختم کرنے کا بنیادی سبب ہی یہ تھا کہ اس کے گرد حصار کھینچ دیا گیا تھا۔ زبانیں، لسانی لین دین، تغیر و تبدل ہی کی بدولت ارتقا کی منزلیں طے کرتی ہیں اس لئے ان کو بیرونی ثقافتوں یا زبانوں کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش مفید نہیں بلکہ مضر ہوتی ہے۔ ہاں ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ جن معاشروں میں عورتوں اور مردوں کے دائرہ کار مختلف ہیں اور باہمی ارتبط برائے نام ہے ان میں عورتوں کی بول چال مردوں سے کچھ مختلف ہی ہوتی ہے۔ اور اس فرق امتیاز کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

لسانی فرق و امتیاز میں سے اکثر کو زمانی اصطلاح میں ''ہم وقتی'' اور مکانی اصلاح میں افقی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگر ایک ہی لسانی گروہ میں ایک ہی زمانے میں یہ فرق و امتیاز انفرادی انداز بیان یا افتاد طبع کے مرہون منت ہوں تو انہیں زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ ورنہ ان میں جو بہت نمایاں ہوتے ہیں انہیں شعوری طور پر سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے کیونکہ وہ ایک اعتبار سے افقی طور پر متصل اور متواتر ہوتے ہیں اور تجربی طور پر ان کا تقابل اور موازنہ کیا جاسکتا ہے یہ سچ ہے کہ زبان کلی طور پر ہم وقتی نہیں ہوتی، وہ تو ایک مسلسل عمل ہے، دلالت کرنے والی آوازوں کے تواتر کا نتیجہ۔ لیکن چوں کہ اسے ایک معینہ دوران میں اضافی طور پر

جامد ادوار کے نظام کا تابع سمجھا جاتا ہے اس لئے اس کے زمانی حصص التقاطع (Cross Sections) کے مطالعے اور تجزیے اور جامد اور تاریخی فرق و امتیاز کے موازنے کا جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک ہی زبان یا بولی کے مختلف تاریخی ادوار کے لسانی حقائق کے تقابل اور موازنے سے تاریخی امتیازات و انحرافات نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ انہیں اضافی طور پر ایک جامد لسانی سطح پر ہی نہیں بلکہ بہت سی پرتوں اور سطحوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر کسی سطح کی کوئی کڑی گم شدہ ہو تو آس پاس کی کڑیوں میں صوتی تبادل کے رخ اور ارتقائی سفر کی کیفیت پر سے قیاس کر کے اس کی نئی تشکیل کرلی جاتی ہے۔ لسانی تغیر کی اصطلاح تاریخی یا متوالی فرق وامتیاز تک محدود ہوتی ہے ہم وقتی اور اضافی طور پر جامد انحراف کو محض عبوری سمجھا جاتا ہے۔ دو متصل ادوار یا تاریخی پرتوں میں فرق وانحرافات برائے نام ہوتے ہیں اور کبھی کبھی قابل توجہ بھی نہیں ہوتے۔ ایسے ادوار اور حالات بھی ہوتے ہیں جن میں انحرافات زیادہ واضح اور نمایاں ہوتے ہیں گویا لسانی تغیرات کی کوئی مخصوص شرح نہیں ہوتی۔

لسانی تغیرات صوتی بھی ہوتے ہیں صرفی و صوریاتی بھی، لغوی و معنویاتی بھی اور نحوی بھی۔ ان تغیرات میں سے صوتی تغیرات پر توجہ زیادہ مبذول کی جاتی رہی ہے۔ اصوات، معانی اور نحوی رشتوں کے مقابلے پر زیادہ صریحی ہوتی ہیں اور ان کی تنقیح زیادہ صحت کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔ صوتی انحرافات کلموں کی ہیئت کو متاثر کرتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو صرفی اور لغوی ارتقا صوتی تغیرات ہی کا نتیجہ ہے۔ جہاں

کچھ ختم کردیا ہے لیکن دنیا کے بعض خطوں میں اب بھی ایسے قبیلے ہیں جن کی عورتوں کی زبان مردوں کی زبان سے خاصی مختلف ہے Dominican Bretan نے ۱۶۶۴ء میں پہلی بار کیریبین قبیلے کی اس خصوصیت کی نشان دہی کی تھی۔ سترھویں صدی ہی میں رو شفورٹ نے اس قبیلے میں بہت دنوں تک زندگی بسر کرنے کے بعد اس خصوصیت کی تفصیل پیش کی اور اس کی توجیہ بھی کی۔ روما کی مشہور شخصیت سسرو سے یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ ''میں جب اپنی ساس کی باتیں سنتا ہوں، مجھے بلا طوس اور ''نے وی اس'' یاد آجاتے ہیں کیوں کہ عورتیں فطری طور پر زبان کو مسخ ہونے سے محفوظ رکھتی ہیں''۔ یسپرسن کا خیال ہے کہ انگریزی کے صوتی نظام کے بعض تغیرات کو عورتوں کے عمدہ اور جچے تلے تلفظ کا مرہون منت بتایا جاتا رہا ہے۔ عام طور پر عورتیں ان عامیانہ اور مبتذل کلموں اور محاوروں سے پرہیز کرتی ہیں، جنھیں بہت سے مرد بلا تکلف استعمال کرتے ہیں وہ اپنی فطری حیا کی وجہ سے جسم کے بعض اعضا کے مروجہ ناموں اور ان کے تفاعل کا ذکر اگر کرتی بھی ہیں تو ڈھکے چھپے انداز میں۔ ان کے سرمایہ کلمات، روز مرہ اور محاوروں کا کچھ حصہ انھی سے مختص ہوتا ہے۔ مرد انھیں استعمال نہیں کرتے۔ اگر کریں تو ان کا مذاق اڑایا جائے۔ مثلاً اردو دنیا میں نوج۔ نگوڑا۔ اوئی۔ ہائے اللہ۔ جیسے کلمے عورتوں ہی کی بول چال میں سنائی دیتے ہیں۔

بعض پرانے اردو مصنفین اور شعرا اہل زبان عورتوں سے زبان کی سند لیتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عورتوں کا ارتباط دوسری زبان بولنے والوں سے نہیں ہوتا تھا اور

مردوں کی زبان کی طرح ان کی زبان خارجی اثرات سے مسخ نہیں ہوتی تھی، اس لئے اپنی اصل حالت میں محفوظ رہ جاتی تھی۔ برج موہن دتاتریہ کیفی کی رائے ہے کہ ''زبان کی صحت، روز مرہ کی تازگی اور محاورے کی شگفتگی عورتوں کی بدولت ہوا کرتی ہے۔ اردو میں بہت سے ہنگامہ خیز عہد آئے، فارسی عربی نے پلچ پلچ کر اس پر حملے کئے - وہ جو ان حملوں سے بال بال بچی، یہ سب عورتوں کا تصدق ہے - ان کی ذہنیت میں نفاست اور ان کے مذاق میں لطافت کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور یہ اردو کی خوش نصیبی تھی کہ جدید زبانوں سے عورتوں کو سابقہ نہ ہوا۔ ان کو اردو کی صحت اور تازگی کا امین سمجھنا چاہئے زبان اور بیان میں جس قدر اختراع اور جدت ان کی ذات سے ہوئی اور جو دل کش اور معقول محاورے اور سبق آموز کہاوتیں ان کے ذہن نے پیدا کیں، ہمیشہ یاد گار رہیں گی - یہی وجہ ہے کہ زبان میں عام لوگوں کو ترجیح دی جاتی ہے کیوں کہ ان کی معلم ان کی ماں ہوتی ہے، کتاب نہیں ''— (کیفیہ صہ ۱۱۴ برجموہن دتاتریہ کیفی)

علامہ کیفی کی اس رائے میں قدامت پرستی کی بو جھلک نظر آتی ہے - اس میں شک نہیں کہ زبان کے معیار اس کی صحت وغیرہ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور ماضی کے ذخیرہ لغوی کی اپنی جگہ ایک اہمیت ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ زبان کے گرد ایسا حصار کھینچ دیا جائے کہ وہ آس پاس کی بولیوں، یا دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے اثرات سے بالکل محفوظ رہے اور زندگی اور سماج کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے آنکھیں بند کرلے، اس طرح زبان سکڑ کر رہ

ہر وقت سانچے میں ڈھلی ہوئی زبان استعمال کرے اور اب و لہجہ، کلموں کی نحوی ترکیب میں کبھی کسی قسم کا فرق نہ آنے دے۔ پھر ایک فرد کی زبان، لب و لہجہ، آہنگ، زیر و بم نقرہ وغیرہ کے اعتبار سے دوسرے فرد کی زبان سے ہو بہو مماثلت نہیں رکھتی۔ ایک شخص ایک بات جس لہجے اور آہنگ سے ادا کرتا ہے، دوسرا اسی بات کو بعینہ اسی طرح ادا نہیں کرتا گویا ایک ہی زبان بولنے والے مختلف افراد کی بول چال کا انداز ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ مختلف ضرور ہوتا ہے، یہ اور بات ہے کہ یہ اختلافات، اظہار و ابلاغ میں رکاوٹ نہیں بنتے اور ان پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔

اگر سماج میں ہم آہنگی نہ ہو اور اس میں ثقافی اعتبار سے مختلف سطحیں ہوں اور پیشوں، مشاغل اور معمولات کے لحاظ سے متعدد گروہ یا زمرے ہوں تو پھر اس سماج میں بول چال کے اختلافات زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ سماجی گروہوں کے اپنے اپنے دائرہ، کار باہمی رشتے، انداز فکر، ثقافتی پس منظر، زندگی کی طرف رویہ اور گروہی تقاضے ہوتے ہیں۔ ان سب کا اثر ان کی زبان پر بھی پڑتا ہے۔ ان کے مخصوص لغوی سرمائے، اسالیب بیان، لب و لہجہ کو دوسرے گروہ سے ممتاز کیا جا سکتا ہے۔ کسی گروہ کا دوسرے گروہ کے ساتھ زیادہ اختلاط نہ ہو تو اس کی لسانی خصوصیات، اپنی مابہ الامتیاز حیثیت برقرار رکھتی ہیں۔ مثلاً اردو کی کرخنداری بولی جو دہلی کے اہل حرفہ، مزدور دکاندار وغیرہ بولتے آئے ہیں اور جس کے نمونے چاندنی چوک کے آس پاس کے علاقوں میں اکثر سننے میں آتے ہیں، اب بھی اپنی مخصوص حیثیت برقرار رکھتی ہے۔ اس کی صرفی

نظام اردو سے قدرے مختلف ہے ہونٹوں سے مدور کردہ پچھلے مصوتوں کے استعمال کا رجحان کرخنداری میں زیادہ ہے۔ پہلے سلیبل کے "الف" کو "زبر" سے بدل دینے کی عادت مثلاً بجائے پاجامہ' بازار' کارخانہ' چارپائی وغیرہ کے "پجامہ" "بزار" - "کرخانہ" - "چرپائی" کہا جاتا ہے - درمیانی یا آخری مصوتے کو انفیانے کا رجحان بھی مثلاً (چونک) (چوک)۔ (ڈانک) (ڈاک)۔ سونچ (سوچ)۔ پینچ (پیچ)۔ گھانس (گھاس) وغیرہ - کرخنداری ہائیہ کو حذف کردیتی ہے یا ہمزہ سے بدل دیتی ہے مثلاً یہاں سے یاں' وہاں سے واں' رہی سے رئی - کہا سے کئیا - کہتے سے کئتے وغیرہ - مخلوط ہائیوں کو وقفیوں میں بدل دیتی ہے مثلاً بھائی' وئی بن جاتا ہے' تجھ کو مجھ کو تجکو' مجکو میں بدل جاتے ہیں' کچھ' ادھر کی جگہ کچ ودر لے لیتے ہیں - حلقی آواز "ق" "خ" میں بدل جاتی ہے شوق سے شوخ' مذاق سے مذاخ' وقت سے وخت۔ طلاق سے طلاخ - ابتدائی "الف" "و" میں بدل جاتا ہے مثلاً اس سے وس ان سے ون وغیرہ -

کرخنداری بولی کے نمونے سنئے - دیکھئے عام اردو بول چال سے کتنے مختلف ہیں۔ دوڑتا وا آیا - مفت نئیں رئنا - جو میں کئیا وہ سنتا ای نئیں - بوت بگڑا وا ہے کاں جارے ابے وئی میرے آگو تو وس کا نام ای نالو - بڑبڑاتا وا میرے کنے آیا - میرے کینے کی پروانہ کری -

تقریباً تمام زبانوں میں مردوں اور عورتوں کی بول چال میں اختلاف رہا ہے - تہذیبی ارتقا نے اس اختلاف کو بہت

ایک طرف کلموں، معانی اور نحو کی کایا کلپ، ترکیب و امتزاج کے لئے رکاوٹ محسوس ہوتی ہے، دوسری طرف صوتی تغیرات، تعمیم کی خواہش کو فوری طور پر مطمئن کردیتے ہیں، اسی لئے ''صوتی قوانین'' کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ ایک ہی زبان کے لغوی سرمائے میں بہت سے صوتی تغیرات کم و بیش مستقل طور پر کار فرما رہتے ہیں۔ جرمانی صوتی تبادل سے ایک کلاسیکی مثال دی جاسکتی ہے۔ ہند یورپی مہموسہ یا غیر مصمیت و قفیہ آوازیں پ، ت ک قدیم جرمانی میں مہموسہ یا غیر مصمیت صفیر یہ آوازیں یعنی ف، تھ، خ ان گئیں جہاں کہیں ایسے تغیرات نہیں ہوئے وہاں رکاوٹ کے اسباب ایک سے ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہند یورپی مصمتی خوشوں sk ‘st ‘sp میں مہموسہ یا غیر مصمیت آوازیں باقاعدگی سے محفوظ رہ جاتی ہیں ایسے صوتی تغیرات جو کسی زبان کے تمام لغوی سرمائے یا اس کے بشیتر حصے میں باقاعدگی سے ملتے ہیں، انھیں تعمیری یا اساسی تغیرات کہا جاتا ہے۔ اور جو خال خال کلموں میں اس آواز کے تعمیری یا اساسی تغیرات کے بر عکس ہوں، انھیں اتفاقی قرار دیا جاتا ہے۔

دوسرے نقطہ نظر سے صوتی تغیر آس پاس کی آوازوں کی ماہئیت پر منحصر دکھائی دے سکتا ہے یا ان سے بالکل آزاد اور بے تعلق۔ اگر کوئی آواز آس پاس کی آوزوں کے زیر اثر بدل جاتی ہے تو اس تبدیلی کو متوسل کہا جلتا ہے ورنہ خود اختیاری بے ساختہ تغیر سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اگر ہم ایک آواز کے ارتقا کے دو بین اور واضح درجوں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ تبدیلی بتدریج ہوئی ہے اور ان

دونوں درجوں کے درمیان اور بہت سی کڑیاں بھی تھیں -

صوتی تغیرات کو اس طرح نظریاتی طور پر قسموں اور درجوں میں تقسیم کرنا تو آسان ہے لیکن جب عملی اور تجربی تقسیم کی نوبت آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ قسمیں ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہوجاتی ہیں اور جس صوتی تغیر کو آزاد یا خود اختیاری قرار دیا جاتا ہے وہ بھی کچھ نہ کچھ مشروط ضرور ہوتا ہے - یہ اور بات ہے کہ ہم اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے ان شرائط کو دریافت نہ کرسکیں - ہر زبان کی ہر آواز میں خفیف سے انحراف کی گنجائش ہوتی ہے اور گنجائش کی نوعیت اور صورت ہر زبان میں جداگانہ ہوسکتی ہے - لیکن چوں کہ یہ صوتی انحرافات متوارث اور متلازم رحجانات کے عمل اور رد عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں اس لئے تدریجی ہوتے ہیں ان رحجانات کی دو ٹوک تشکیل بہت مشکل ہے - میکانکی اور قیاسی تغیرات کو خانوں میں بانٹنا بھی ممکن نہیں کیونکہ عام طور پر صوتی تغیر خالصتہ میکانکی ہوتا بھی نہیں - بول چال کی ہر آواز کسی زبان کے خصوصی نظام کا ایک حصہ ہوتی ہے اور نظام کی ترتیب یا نظم و ترتیب ایک نفسیاتی عمل ہے - اور پھر قیاسِ تمثیلی کا زور' نام نہاد میکانکی صوتی تغیر پر کچھ نہ کچھ زور پڑتا ہے -

نطقی اور سمعی بنیادوں کی تبدیلی

کچھ خصوصیات ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی تبدیلی زبان کے صوتی نظام کو بہت کچھ بدل دیتی ہیں - یہ ہیں نطق' سماعت اور لہجے کی بنیادیں - ماہرین صوتیات کے نزدیک نطقی بنیاد سے مراد ہے

مختلف اعضائے نطق کی وہ حالت جو خاموشی کے عالم میں ہوتی ہے۔ اور یہ حالت ورثے یا اکتسابی عادت کا کرشمہ ہوتی ہے اس لئے ہر زبان میں تھوڑی بہت مختلف ضرور ہوتی ہے مجموعی سمعی اکائیوں کی آوازوں کی متعینہ گروہ بندی' سمعی بنیاد کہلاتی ہے۔ اسی بنیاد پر سامع مختلف سمعی کیفیتوں میں تمیز کرتا ہے۔ انگریزی میں مہموسہ یا غیر مصیت "p" کی سمعی تمیز کا دارومدار اس کی مصیت "b" کی جچی تلی تفریق پر ہوتا ہے جبکہ مڈل اور اپر جرمن بولیوں میں "p" اور "b" سمعی طور پر ایک ہی صوتی اکائی محسوس ہوتے ہیں اس لئے جب ایک زبان بولنے والا دوسری زبان بولتا ہے تو اپنی صوتی عادت کی وجہ سے اس میں کچھ نہ کچھ صوتی تصرف بھی کرلیتا ہے۔ اور یہ تصرف غیر شعوری طور پر ہوتا ہے۔ جب ایک انگریز فرانسیسی بولتا ہے تو غیر شعوری طور پر اپنی انگریزی کی نطقی بنیاد پر تلفظ ادا کرتا ہے اور اپنی انگریزی کی سمعی تمیز کی بنیاد پر فرانسیسی آوازوں کو پہچانتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی جرمن یا فرانسیسی' انگریزی بولتا ہے تو اپنے لب و لہجہ سے ہی ظاہر کردیتا ہے کہ وہ اہل زبان نہیں اور اس کی اپنی نطقی اور سمعی بنیادوں کی وجہ سے انگریزی کی بعض اصوات بدل جاتی ہیں۔ مختلف زبانوں کے اختلاط سے ان کی اصوات میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں ضرور ہو جاتی ہیں۔ قدیم ماہرینِ لسانیات مخلوط زبانوں کے وجود کے قائل نہیں تھے۔ لیکن جدید محققین نے زبانوں کے اختلاط کو بڑی اہمیت دی ہے۔ جب ایک قوم اپنی زبان ترک کر کے دوسری زبان اختیار کرتی ہے تو لسانی اختلاط کا کرشمہ نت نئی

اصوات کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ جرمانی صوتی تبادل نتیجہ ہے ہند یورپی اور غیر ہند یورپی بولیوں کے اختلاط کا۔ **چلی** میں بولی جانے والی ہسپانوی زبان میں وہاں کی قدیم **اروکن** زبان کی اصوات بھی در آئی ہیں۔ سنسکرت کی لثوی آوازوں کو دراوڑی کا اثر بھی قرار دیا جاتا ہے لیکن **یسپرسن** نے اس کی تردید کی ہے۔ اس کی رائے ہے کہ جب دراوڑی زبانوں میں لثوی اصوات ٹ،ڈ، ''لثوی ن'' کے ساتھ ساتھ دندانی آوازیں ت، د، ن بھی تھیں تو پھر دراوڑوں نے آریائی ت،د،ن، کو لثوی کیوں بنادیا، وہ تو دندانی اصوات کے بھی عادی تھے۔ اور پھر سنسکرت میں لثوی آوازیں مخصوص موقعوں پر ہی پیدا ہوتی ہیں خصوصاً ''ر'' کے زیر اثر۔ اکثر زبانوں میں صفیریہ ''ر'' کی ادائیگی کے وقت زبان کی نوک دانتوں کے پچھلے سروں سے بھی آگے مس کرنے لگتی ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس سے متصل دندانی آواز بھی اس کے ساتھ ادا کی جاتی ہے تو پھر وہ دندانی کے بجائے کسی قدر لثوی ہوجاتی ہے۔ سویڈش اور مشرقی نارو کیبین میں بھی لثوی ٹ، ڈ، لثوی ن آوازیں ملتی ہیں۔ امریکی انگریزی میں بھی ''r'' سے پہلے یا بعد کی ''d'' کی آواز لثوی ہوجاتی ہے۔

جیکب گرام (Grimm) کے زمانے سے گوتھانک صوتی تبادل ماہرین لسانیات کے ذہنوں پر بہت دنوں تک مسلط رہا ہے۔ اس کی توجیہات بھی کی جاتی رہی ہیں لیکن یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ اس تبادل کا سبب کون سی قوم یا کون سی زبان ہے **ویزلی** (۱۹۱۷) نے یہ وضاحت کی ہے کہ رہمتو رومانی

اثر سے آبر جرمن تبادل' کیلٹک کے زیر اثر ہائی جرمن اور فنی (Finnic) کے اثر سے جرمانی تبادل ظہور پزیر ہوئے لیکن جدید فنی یا قدیم یوگروفنی زبان کے صوتی نظام سے تیسرے تبادل کا ثبوت فراہم کرنا ممکن نہیں۔ یسپرسن نے ایسکولی کے اس خیال کی بھی تردید کی ہے کہ لاطینی "u" کی جگہ فرانسیسی "y" کا تبادل گال قوم کے زیر اثر ہوا ہے۔ ایسکولی نے ہسپانوی "h" کو لاطینی "f" کا تبادل قرار دیا ہے اور رومن حملے کا اثر بتایا ہے۔ یسپرسن کی یہ رائے ہے کہ یہ تبادل رومن حملوں کے صدیوں بعد ظہور پذیر ہوا سالونیکا کے ہسپانوی بولنے والے یہودی جنہوں نے جلا وطنی اختیار کی "f" کو "h" سے نہیں بدلتے تھے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نسلی اختلاط کے نتیجے میں زبانوں کے صوتی نظام میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انفرادی اصوات کی تدریجی تبدیلی سے نطقی اور سمعی بنیادوں میں بھی تھوڑی بہت تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ ان تبدیلیوں کے اسباب کا جائزہ آگے چل کر پیش کیا جائے گا —

لب و لہجہ کی تبدیلی۔ دور رس صوتی تغیرات میں لب و لہجہ کی تبدیلی کی بھی کار فرمائی ہوتی ہے۔ صوتی تغیرات میں حذف و سقوط' مرکب مصوتوں کا مفرد ہوجانا' مفرد مصوتوں کا مرکب ہوجانا مصوتوں یا مصمتوں کا ادغام اور نئے مصوتے یا مصمتے کی تشکیل' مصوتوں اور مصمتوں کی جگہ کی تبدیلی وغیرہ کو خاصی اہمیت دی جاتی ہے۔ لسانیات

کی اصطلاحات میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اصوات کا اشباع بھی ہوجاتا ہے مثلاً پراکرت کامے اگی - ہتھی' ددہ اردو میں اشباع سے اگ' ہاتھی دودھ بن گئے - اصوات کی سندھی یا تعلیل بھی ہوتی ہے یعنی دو مصوتے یا مصمتے مدغم ہو کر تیسرے مصوتے یا مصمتے کی شکل اختیار کرلیتے ہیں - اس قسم کے تغیرات کی بڑی وجہ لہجے کی تبدیلی ہے -ہند یورپی میں صوتی تغیرات کے بہت سے مظاہر ایسے ہیں جن کی توجیہ نہیں کی جاسکی ہے اور جنھیں تعلیل مجہول یا ablaut کہا جاتا رہا ہے - ان میں مصوتے کے باقاعدہ مدارج بھی ہیں ان کے آثار انگریزی کے قوی افعال اور مشتقات میں پائے جاتے ہیں مثلاً sing' sang sung' song وغیرہ میں- غالباً یہ نقرہ کے تغیرات کے کرشمے ہیں - جرمن کلموں Vater اور Bruder کے درمیانی مصمتے ''t' اور ''d'' کے تضاد کی توجیہ یہ کی جاتی ہے کہ Vater کی ہند یورپی اصل میں نقرہ دوسرے سلیبل پر تھا اور Bruder کی ''اصل'' میں نقرہ پہلے سلیبل پر تھا (ورنر کا قانون) - ہر ماہر اشتقاقیات کو یہ ملحوظ رکھنا پڑتا ہے کہ کسی زبان میں لہجہ اور نقرہ ارتقا کے عام قانون سے آزاد نہیں رہ سکتا - قدیم ہند یورپی میں لہجہ اور نقرہ غنائی اور آزاد تھا لیکن بعد میں اس سے ارتقا پانے والی زبانوں میں معین اور حرکی ہوگیا - قدیم جرمانی میں بھی کسی قدر آزاد رہا لیکن بعد میں ابتدائی سلیبل میں معین ہوگیا - سنسکرت کلمہ ''پر'' کی آخری آواز متحرک تھی لیکن جب وہ حذف ہوئی تو کلمہ ایک سلیبل کا ہوگیا اور زور ''پ'' پر پڑا تو اس کے مصوتے ''و'' (پیش) کی آواز کھنچ گئی اور کلمہ ''پور'' بن گیا - کبھی کبھی زور یا نقرہ

کو دو مختلف نسلوں کے ارتباط کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے مثلاً جرمانی زمرہ کی زبانوں کے ابتدائی نقرہ کی توجیہ یہ کی جاتی ہے کہ یہ ہند یورپی اور غیر ہند یورپی لہجوں کے ارتباط کا کرشمہ ہے۔ کبھی کبھی یہ بھی ممکن ہے کہ آواز کے زیروبم، ہلکی گونج، سلیبل کی مقدار اور لہجے کے خفیف سے تغیر کی وجہ سے نقرہ یا زور کلمے کے ایسے حصے پر محسوس ہو جہاں حقیقتاً نہیں ہوتا اور پھر غلط فہمی، نقرہ کی ایک نئی روایت قائم کرسکتی ہے۔ کثیرالمقاطع کلمے میں ابتدائی اور ثانوی نقرہ کے درمیان فرق محسوس نہ کیا جائے تو ان میں خلط ملط ہوسکتا ہے یا وہ ایک دوسرے کی جگہ لے سکتے ہیں۔ قیاس تمثیلی بھی کلمے کے اصل لہجے میں تبدیلی کا موجب ہوسکتا ہے۔ دوسری زبانوں کے کلمے اپنائے جاتے ہیں تو اپنے لہجے کے خراد پر تراش خراش کے بعد۔ اسی بات کو یوں بھی کہا جاتا ہے کہ ہر زبان دوسری زبانوں سے لئے جانے والے کلموں کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ مثلاً مرلکا، یوکترکا، ارچس، بھکشا، وائی واہنی یا بھگنی، پکشا، اکشی، وواہ، وردھانا وغیرہ کی تھنید یا تارید سے مٹی، جوڑی آنچ، بھوک، بہن، پنکھ، آنکھ، بیاہ، بڈھنا وجود میں آئے۔ پرتگالی ‘comiesa ‘mesa gudao ‘betelha ‘ganella ‘balde کو اردو لہجے اور مزاج نے میز، قمیض، بالٹی، گملا، بوتل گودام بنادیا۔

دوسرے خصوصی تغیرات۔ مصمتے کی مصوتے میں تبدیلی، جسے انگریزی میں vocalization سے تعبیر کیا جاتا ہے، کلمے کو خاصا بدل دیتی ہے۔ انگریزی کلمے

swallow میں ''w'' کی آواز o میں بدل جاتی ہے اسی طرح
brain میں ''i'' دراصل ''g'' ہے' کیونکہ قدیم انگریزی میں
یہ کلمہ ہے brieg (e) n - اس میں دوہری مصمتی آواز
(dipthong) بھی پیدا ہوئی یعنی ''g'' کی بجائے ''ei'' کی
آواز - اینگلو سیکسن کلمے hus اور is انگریزی میں دوہری
مصمتی آواز کی وجہ سے house اور ice بن گئے - اس کے برعکس
دوہری مصمتی آواز کو ایک مصمتی آواز میں بھی بدل دیا جاتا
ہے مثلاً وسطی انگریزی brouhte douhter میں ''ou'' کی
دہری مصمتی آواز' جدید انگریزی میں a رہ گئی مصوتوں کو
طویل اور قصیر بنا کر بھی کئی تغیرات کرائے جاتے ہیں -
اس کا دارومدار لہجے' صوتی ماحول' سلیبل بنانے کی عادت
وغیرہ پر ہوتا ہے انگریزی اور جرمن زبانوں کی تاریخ میں
کھلے سلیبل میں مصوتوں پر زور دیا جاتا ہے تو وہ طویل
ہوجاتے ہیں اور بند سلیبل میں یہ زور مصوتے کو قصیر بنا دیتا
ہے مثلاً قدیم انگریزی کلمے cepan میں پہلا سلیبل کھلا تھا
اور مصوتے ''e'' پر نقرہ تھا اس لئے وہ طویل ہوگیا اور
جدید انگریزی میں keep بن گیا - اس کے ماضی قدیم انگریزی
میں cepte کے بند سلیبل (روی) میں ''e'' پر زور ہونے سے
وہ قصیر ہوگیا اور جدید انگریزی میں kept ہو گیا سنسکرت
''مشل'' میں پہلا سلیبل کھلا ہوا یا وتد ہے' اس کے مصوتے
''پیش'' پر زور پڑا تو وہ طویل ہوگیا اور اردو تک ''موسل''
کی شکل میں پہنچا - مصوتے کے نقرہ نے اسی طرح ''پر'' کو
''پور'' بنا دیا - مصوتے کو کھینچنے یا طویل بنانے کا عمل
لسانیات کی اصطلاح میں ''اشباع'' کہلاتا ہے - سنکرت گرامر

نویسوں نے اسے ""گن"" سے تعبیر کیا ہے۔ ہند آریائی زبانوں میں اردھ ماگدھی اور مہاراشٹری میں اشباع کا رجحان خصوصی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو میں بھی یہ رجحان کسی قدر ملتا ہے مثلاً اردو یا ہندی نے اصل کلموں نند۔ سندور۔ بلو۔ ککش وغیرہ ہیں اشباع کا عمل لیا اور انہیں توند۔ سیندور۔ بیل کوکھ کی صورت دے دی۔ اردو نے سنسکرت اور پراکرت کے بعض مشدد آوازوں کو جوں کا توں اپنالیا لیکن کچھ کلموں کی مشدد آوازوں میں سے ایک کو حذف کرکے ماقبل مصوتے کا اشباع کر لیا مثلاً پراکرت اگی کو آگ بنالیا۔ ""بنھی"" کو ""باتھی"" کہا۔ ددھ میں اشباع کیا تو وہ دودھ بن گیا۔ اردو نے جن کلموں کی مشدد آوازوں کو گوارا کر لیا، ہریانی نے ان میں بھی اشباع کا عمل کیا۔ مثلاً مکھن سے ماکھن۔ مٹی سے ماٹی۔ ہڈی سے ہاڈ۔ رکھے سے راکھے۔

ایک کلمے کے دو مختلف سلیبل کے پاس پاس ادا ہونے والی ہم مخرج آوازوں کو متجانس کرلینے کا رجحان بھی ہوتا ہے۔ مثلاً ""ر"" اور ""ل"" ساتھ ساتھ ہوں تو دونوں کو ""ر"" یا دونوں کو ""ل"" بنالیا جائے گویا ایک طرح سے مشدد کرلیا جائے یا آوازیں ہم مخرج نہ بھی ہوں تو انہیں ایک جیسی بنالیا جائے۔ اس عمل کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔ (۱) دوسرے سلیبل کی پہلی آواز کو پہلے سلیبل کی آخری آواز کے مطابق ڈھال لیا جائے مثلاً لاطینی کلمے ""colnis"" میں دوسرے سلیبل کی ابتدائی آواز ""n"" کو پہلے سلیبل کی آخری آواز ""ل"" میں بدل کر ""collis"" بنالیا گیا۔ اس طرح کے عمل کو اگلی سمت کا عمل یا progressive کہتے میں۔ (۲) پہلے

سلیبل کی آخری آواز کو دوسرے سلیبل کی پہلی آواز میں بدل لیا جائے مثلاً لاطینی interlego میں " inter " کے " r " کو " l " بنادیا جائے اور نیا کلمہ intellego بن جائے لیکن مفہوم وہی ہے۔ اس عمل کو Regressive کہا جاتا ہے (۳) تغیرات کی یہ دونوں صورتیں بھی بیک وقت کارفرما ہوسکتی ہیں مثلاً سنسکرت " بھتا " سے " بدھا " جب حلقوی اور غشائی (تالو کے نرم حصے سے ادا ہونے والی آوازیں ص، ض، ط، ظ وغیرہ) آوازیں متجانس بنائی جائیں یا ان کا ادغام ہو اور وہ حنکی بن جائیں تو اس عمل کو palatalization کہتے ہیں اور جب کوئی آواز "س" یا "ز" میں بدلتی ہے تو اسے Assibilation سے تعبیر کرتے ہیں۔ اول الذکر کی مثال میں انگریزی کلموں' chalk 'cheerl 'charch وغیرہ میں ابتدائی جاریہ آوازیں در اصل (k) کو حنکی بنانے کا نتیجہ ہیں۔ مصوتے کا انفیانا بھی کسی قدر حنکی بنانا ہے۔ تغیرات کے اس طرح کے عمل کو عام طور پر میکانکی کہا جاتا ہے۔ جب بدلنے والی آوازیں متصل نہ ہوں' تو ان کی تبدیلی کو محض میکانکی قرار دینے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ انہیں بھی قیاسی سمجھا جاسکتا ہے۔ اصوات کی میکانکی اور قیاسی تبدیلیوں کے درمیان حد فاصل کھینچنا بہت مشکل ہے۔

اسی طرح ایک کلمے میں دو مخرج آوازوں یا ایک ہی آواز کی تکرار کو' خواہ وہ متصل ہوں یا کچھ فاصلے پر' ممتاز کرنے کے لئے کچھ تغیر کردینے کا رجحان بھی ہوتا ہے مثلاً لاطینی captus جرمن میں haft ہوگیا۔

اصوات کے اضافے یا سقوط سے بھی کلموں میں تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ لسانیات میں اس طرح کی گروہ بندی اصوات کے محل و قوع کے لحاظ سے کی جاتی ہیں۔ اگر آواز کا اضافہ کلمے کے آغاز میں کیا جاتا ہے تو اس عمل کو prosthesis کہتے ہیں۔ اینگلو سیکسن کلمے cwesan کے آغاز میں "s" کے اضافے سے انگریزی کلمہ squeeze بن گیا۔ ekename میں "n" بڑھا کر nickname بنا لیا گیا۔ صوتی اضافے کا عمل کلمے کے آخر میں بھی ہوتا ہے مثلاً وسطی انگریزی کلمے ernes کے آخر میں "t" کے اضافے سے انگریزی کلمہ earnest بنا لیا گیا۔ ageines کے آخر میں "t" بڑھا کر against بنا لیا۔ اس عمل کو Paragage کہتے ہیں۔ کلمے کے درمیان میں اضافہ کر کے بھی کلمہ بدل دیا جاتا ہے مثلاً فرانسیسی "کاپورل" میں "ر" کے اضافے سے "کارپورل" وجود میں آگیا۔ اس عمل کو Epenthesis کہا جاتا ہے اس کا رجحان مشرقی ہند آریائی زبانوں مثلاً بنگالی، آسامی اڑیا میں پایا جاتا ہے۔ گجراتی، لہندا اور دردی زبان میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ شورسینی پراکرت میں بھی خال خال مثالیں مل جاتی ہیں لیکن مغربی ہندی کی شاخوں اردو وغیرہ میں یا مراٹھی اور سندھی میں یہ رجحان نہیں ہے۔ ابتدائی آواز کا سقوط ہو تو اس عمل کو Aphesis کہتے ہیں۔ Knife اور write میں ابتدا میں k اور w کی آواز کا واضح اعلان ہوتا تھا لیکن بعد میں یہ آوازیں ساقط ہوگئیں یہ اور بات ہے کہ تحریر میں ان کو باقی رکھا گیا ہے۔ alone کے "a" کو اڑا کر "lone" کر دیا گیا ہے۔ بعض علاقوں میں "اناج" کا الف حذف کر کے "ناج" کہا جاتا

ہے۔ "ابھتیر" کا الف گرا تو "بھتیر" رہ گیا۔ "ارگھٹ"۔ "آبی"۔ "ابھ انچ" الف کے سقوط سے پہلے ارہٹ۔ بی ابھینگ بنے اور پھر ہندی یا اردو میں آ کر رہٹ' بھی اور بھینگا بن گئے۔ کلمے کی آخری آواز کو اڑا دینے کا رجحان ہند یورپی زبانوں میں عام ہے انگریزی اور بعض جدید ہند آریائی زبانوں خاص طور پر اردو کی تو یہ نمایاں' خصوصیت ہے۔ صوتی سقوط کا یہ عمل Apocop کہلاتا ہے۔ وسطی انگریزی کے اکثر کلموں کی آخری آواز "e" کو جدید انگریزی میں حذف کر دیا گیا ہے۔ مشرقی ہندی' کی شاخوں اور برج بھاشا' قنوجی وغیرہ میں یہ رجحان نہیں لیکن اردو آخری مصوتے کو گوارا نہیں کرتی۔ ندرا۔ وارتا۔ چھایا۔ بگھنی ہر بکشا وغیرہ کے آخری مصوتے کو حذف کر کے نیند' بات' چھاؤں۔ بہن۔ ہر کھ وغیرہ بنا لیا گیا ہے۔ کلمے کے اندر کی آواز اپنی جگہ بدل سکتی ہے۔ "ر" کی آواز عام طور پر زیادہ جگہ بدلتی ہے۔ مثلاً۔ borst سے breast - verach سے fresh - persen سے press - کلمے کی آوازیں ایک دوسرے سے جگہ بدل لیتی ہیں مثلاً گرہ سے گھر۔ قلب کی مثالیں عوامی اردو میں بھی ملتی ہیں مثلاً فصیل کو بدل کر صفیل کہا جاتا ہے۔ مطلب بگڑ کر مطل ہو جاتا ہے۔ دیگچی کو دیچکی بھی کہہ دیتے ہیں۔ کچھ زبانوں میں مصوتوں کو قصیر بنا دینے یا ان کو مختصر کر دینے سے بعد کے مصمتے مشدد ہو جاتے ہیں۔ پراکرتوں میں میں قصیر مصوتوں کے بعد مشدد مصمتے بھی ہوتے تھے۔ بعض جدید ہند آریائی زبانوں نے اس خصوصیت کو محفوظ رکھا ہے۔ پنجابی اور راجستھانی میں یہ خصوصیت نمایاں ہے۔ اردو کی

کرخنداری بولی میں بھی اس کی مثالیں ملتی میں چادر کو چدر ۔ دالان کو دلان ۔ چاقو کو چکو ۔ دروازہ کو وروزہ ۔ برابر کو بربر ۔ کہا جاتا ہے ۔

قدیم ترین زبانوں میں دوہرے اور تہرے مصمتے زیادہ استعمال ہوتے ہیں ۔ اب بھی بہت سی زبانوں میں مصمتی خوشے ملتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ بعض میں کلموں کی ابتدا میں مصمتی خوشوں کا رجحان زیادہ ہے اور بعض درمیان یا آخر میں مصمتی خوشے استعمال کرتی ہیں لیکن کچھ زبانوں میں مصمتی خوشوں کو اب گوارا نہیں کیا جاتا ۔ ان زبانوں کے بولنے والوں کی صوتی عادت ہے کہ ان مصمتی خوشوں کے درمیان میں مصوتہ استعمال کر کے الگ الگ سلیبل میں تقسیم کرلیں ۔ فنی اور ہنگری کی زبان میں کلمے کا آغاز مفرد مصمتے سے ہوتا ہے ۔ اگر ان زبانوں کا بولنے والا کسی اور زبان کا ایسا لفظ بولتا ہے جس میں مصمتی خوشے ہوں یا جس کا آغاز مصمتی خوشوں سے ہوتا ہو تو وہ مصمتوں کے درمیان کوئی نہ کوئی مصوتہ ضرور استعمال کرے گا مثلاً Kral کو Kirali کہے گا ۔ اگر مصمتی خوشے کا پہلا مصمتہ صفیریہ (س، ش) ہو تو وہ اس سے پہلے ایک مصوتہ بطور سابقہ بڑھا کر اسے ایک سلیبل (رکن) میں بدل لے گا : مثلاً وہ لاطینی Schola کو iskola کہے گا ۔ تامل زبان کا بھی یہی رجحان ہے تامل بولنے والا ابتدائی مصمتی خوشے کا تلفظ ادا نہیں کرسکتا اگر اس کا پہلا مصمتہ صفیریہ ہوتا ہے تو وہ مصوتے کو بطور سابقہ استعمال کر کے ایک رکن بنا لیتا ہے مثلاً وہ School کو "اسکول" کہتا ہے ۔ بیوہتان کی ستھی مہر میں بھی یہی

خصوصیت نظر آتی ہے - کلمے Sparto کو ہسپانوی زبان میں
"اسپارٹا" لکھا گیا ہے - **میکس ملر** نے زبانوں کے
دوسرے خاندانوں سے بھی ایسی مثالیں پیش کی ہیں - وہ رقم
طراز ہے کہ لاطینی کے بہت سے کلمے Sp 'St 'Sc سے شروع
ہوتے ہیں لیکن ان میں' سے کچھ حضرت عیسیٰ کی وفات کے
چارسو سال بعد کے لاطینی کتبوں میں " i " سے شروع کئے گئے
ہیں مثلاً "isperitus" - شاید کیلٹک قوم کسی مصمتے سے
پہلے کے ابتدائی "s" کی آواز ادا کرنے سے قاصر تھی - مشہور
ماہر لسانیات **پاٹ** (Pott) نے **رچرڈ** کے حوالے سے یہ لکھا
ہے کہ جب کسی ہسپانوی کلمے کا آغاز "s" سے ہوتا ہے
اور اس کے فوراً بعد کوئی مصمتہ یا "w" ہوتا ہے تو درمیان
میں نیم مصوتہ "y" ضرور استعمال کیا جاتا ہے - مثلاً لاطینی
Schola اور Speritus کو Yskol اور Yspryed بنالیا جاتا
ہے - پیرو کے رہنے والے ہسپانوی جب لاطینی پڑھتے تھے تو
Stadium اور Schola کو estadium اور iskola ہی پڑھتے
تھے - ہند یورپی کے مغربی رومانی زمرہ میں اس طرح کے ابتدائی
مصوتے کے استعمال کا رجحان رہا ہے لاطینی Sperare اور
Stabilire فرانسیسی میں ابتدائی مصوتے کے استعمال سے
esperer اور establir بن گئے -" (زبان کی سائنس پر لکچر -
سکینڈ سیریز ص ۱۹۵) - " کلمے کے شروع میں دو یا تین متصل
مصمتوں کا واضح اور صاف تلفظ بڑا مشکل مرحلہ ہے' اس لئے
اس کے مسخ ہونے کا امکان ہوتا ہے چنانچہ ان میں سے کسی
کی آواز حذف ہوجاتی ہے یا پھر درمیان میں کوئی نہ کوئی
مصوتہ استعمال کرنا پڑتا ہے اگر زبان کا رجحان یہ ہے کہ

تلفظ آسان ہو تو پھر ایسی تکلیف دہ ہیئتیں کیوں تشکیل ہوئیں اور ان کو قبول عام کیسے نصیب ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہی ہوسکتا تھا کہ دو مصمتے ایک آواز سے ادا کئے جاتے یا ان کے درمیان مصوتہ لے آیا جاتا " (لکچر ص ۱۸۷) - دنیا کی سینکڑوں زبانیں ایسی ہیں جو کلمے کی ابتدا میں مصمتی خوشے گوارا نہیں کرتیں - اردو صوتیات کا عام رجحان بھی مصمتی خوشوں کے خلاف ہے۔ اردو نے عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی وغیرہ سے بہت سے کلمے لئے ہیں اور ان زبانوں میں مصمتی خوشوں کا عام رجحان ہے - اردو نے خاتمے کے خوشے گوارا کر لئے لیکن ابتدائی خوشوں کے مصمتوں کے درمیان کوئی مصوتہ داخل کردیا مثلاً سنسکرت کلمے Praja Prakrit 'Brahman میں ب ر، پ ر اور پ ر کے درمیان مصوتہ لگا کر برہمن - پراکرت، پرجا بنا لیا - انگریزی کلموں " Station 'Spirit اور School میں مصمتی خوشوں کا آغاز صفیریہ "س" سے ہوتا ہے، اردو نے اس سے پہلے سابقہ "ا" (i) بڑھا کر اسپرٹ - اسٹیشن - اسکول بنالیا - کلمے کے شروع میں مصوتہ بڑھانے کا یہ عمل Pros thesis ہے - اور زبانوں میں اس عمل کی جو بھی توجیہ کی جائے اردو میں یہ توجیہ جائے گی کہ کلمے کے آغاز کے مصمتی خوشے اردو کے مزاج کے خلاف تھے اس لئے اردو کی صوتی عادت نے اس میں اپنے مزاج کے مطابق تصرف کرلیا اور الگ الگ رکنوں (Syllables) میں تقسیم کرلیا -

زبان میں بعض موقعوں پر دو مصوتوں کے درمیان وقفہ سا آجاتا ہے جس سے یا تو صوتی تنافر پیدا ہوتا ہے یا روانی اور آہنگ میں فرق آجاتا ہے - زبانیں مختلف طریقوں سے اس

عیب کو رفع کرتی ہیں۔ مثلاً سنسکرت میں نفی کے لئے الف نافیہ بطور سابقہ کلمے میں بڑھا دیا جاتا ہے مثلاً مٹ، مر وغیرہ سے امٹ، امر وغیرہ۔ لیکن اگر کلمے کا آغاز مصوتے سے ہو تو پھر الف نافیہ میں ''ن'' کا اضافہ بھی کردیا جاتا ہے، اس طرح دو متصل مصوتوں کی وجہ سے جو صوتی عیب یا رکاوٹ پیدا ہوتی ہے وہ رفع ہو جاتی ہے۔ یونانی اور ہند یورپی کے جرمانی زمرے کی زبانوں میں بھی اسی طرح '' i '' اور '' n '' سابقوں کی حیثیت سے بڑھائے جاتے ہیں اور ان کے بعد مصوتہ ہوتا ہے تو پھر '' n '' کا بھی اضافہ کردیا جاتا ہے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ '' i '' اور '' n '' کے بجائے '' in '' اور '' un '' کو سابقے کی حیثیت دے دی گئی۔ سنسکرت میں متصل آنے والے مصوتوں کو ترکیب بھی دے دیا جاتا ہے اور نئی آواز پیدا کرلی جاتی ہے لکین تیلگو اور کنڑی میں ایسے موقع پر درمیان میں '' v '' یا '' y '' استعمال ہوتی ہے۔ تامل میں a,u,o اور ان کی طویل آوازوں اور '' au '' کے بعد 'v' استعمال کرتے ہیں اور 'e'i ان کی طویل آوازوں اور ei کے بعد '' y ''۔ مثلاً vara illei (نہیں آیا) کو vara (v) illei کہا جاتا ہے۔ کنڑی ''آون'' (اس مرد کا) میں ''آ'' اشارہ بعید ہے ور ''ان'' علامت مذکر۔ دو مصوتوں کے متصل ہونے سے صوتی رکاوٹ یا تنافر پیدا ہوا تو اس کو رفع کرنے کے لئے درمیان میں ''و'' استعمال کرکے صوتی روانی پیدا کر لی گئی اور آخر میں علامت اضافت زیر یا (الف قصیر) بڑھا دی گئی۔ اردو بھی دو طویل مصوتوں یا حرکتوں کا اجتماع گوارا نہیں کرتی۔ یہ دونوں مدغم ہو کر نئی صورت اختیار کرلیتی ہیں۔ مثلاً میلکہ ے میل + ے میلا — چلانی ے چل + — چلے

صوتی قوانین یا کلیے - ولیم فان ہمبولٹ نے پہلی بار ۱۸۲۶ء میں لسانیاتی وقوعوں اور بسیط آوازوں کے عام رجحان اور سمتوں کے لئے "صوتی قوانین" کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ چوں کہ **ہمبولٹ** کے پیش نظر ایک محدود لسانی مواد تھا، اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے یہ اصطلاح مبہم طور پر اور استعارے کے مفہوم میں استعمال کی ہوگی۔ اس نے زبان کی ہئیتوں اور اس کی ساخت کو مخصوص سمتوں میں منحرف ہوتے ہوئے دیکھ کر، یہ غور کیا کہ جو مثالیں اس کے سامنے ہیں، کیا ان سب میں انحرافات یا تغیرات کی سمتیں یکساں ہیں اور ان کی یکسانیت کی وجہ سے اس نے "صوتی قوانین" کی اصطلاح وضع کرلی۔ اگر اس اصطلاح کو استعارہ سمجھ لیا جاتا تو کوئی ہرج نہ تھا لیکن اس کے ڈانڈے طبیعی اور عضویاتی قوانین سے ملائے جانے لگے۔

شروع شروع میں اشتقاقیات کی بنیاد ظاہری معنوی مماثلت اور نمایاں صوتی مشابہت پر رکھی جاتی تھی لیکن جب صوتیات نے ایک علم کی حیثیت حاصل کر لی تو پھر صوتیات کی روشنی میں کلموں کی تحقیق ہونے لگی اور اصوات کو معانی سے بے تعلق کر کے، ان کا مطالعہ کیا جانے لگا۔ ان کی تشکیل کی عضویاتی خصوصیت اور ترسیل کے طبیعی پہلو پر زیادہ توجہ مبذول کی جانے لگی۔ اور یہ سمجھ لیا گیا کہ بسیط آوازوں کی تخلیق کا طریقہ خود کار ہوتا ہے اور ان کی پوری داستان میکانکی اور عضویاتی قوانین کے حوالوں سے بیان ہوسکتی ہے۔ اس استنباط کی توثیق بعد کی ان دریافتوں سے کی جانے لگی، جن کا تعلق صوتی تاریخ میں صوتی تغیرات کی باقاعدگی

سے تھا - اور اس بات کو تسلیم کیا جانے لگا کہ صوتی تغیرات، معانی سے آزاد اور بے تعلق ہوتے ہیں - اگرچہ **فرنز بوپ** (۱۷۹۱–۱۸۶۷) بہت سوچ سمجھ کے اصطلاحات استعمال کرتا تھا لیکن اس نے بھی زبان کے سلسلے میں طبیعی اور عضویاتی اصطلاحات استعمال کی ہیں - **ار-سی-ریسک** (۱۷۸۷–۱۸۳۲) **اور جیکب گرم** (۱۷۸۵–۱۸۶۳) نے جرمانی زبانوں اور ہائی جرمن کے مصمتی تبادل کی جو دریافت پیش کی، اس سے یہ حقیقت واضح ہونے لگی کہ صوتی تبادل محض اتفاق نہیں ہوتا - **اے-ایف پاٹ** (۱۸۰۲–۱۸۸۷) کی اشتقاقیاتی تحقیقات صوتی کلیوں ہی پر مبنی تھیں - **جارج کرٹی اس** (۱۸۲۰–۱۸۸۵) لسانی انحطاط کے قوانین کو فطری قوانین کا ہم پلہ سمجھتا ہے۔ **اگسٹ شلیخر** (۱۸۲۳–۱۸۶۸) صوتی کلیوں کی بنیاد پر لسانیات کو طبیعی سائنس قرار دیتا ہے۔ اس وقت سنسکرت اور یونانی کی قدیم ساختوں کی صوتی تبدیلیوں کی باقاعدگی پر زیادہ زور دیا جاتا رہا تاکہ قدیم ترین ہند یورپی کی تشکیل جدید کی جاسکے - لیکن اس کا رد عمل یہ ہوا کہ نئی نسلوں کے ماہرین نے قدیم زبانوں کو چھوڑ کر جدید زبانوں اور ایسی صوتی بے قاعدگیوں پر زیادہ توجہ مبذول کی، جنہیں کسی صوتی قانون کے ماتحت نہیں لایا جاسکتا تھا - یہ مطالعے کا اچھا رخ تھا لیکن آہستہ آہستہ ہوا یہ کہ وہ صوتی بے قاعدگیاں جن سے اس وقت کے مسلمہ صوتی کلیوں کی تردید ہوتی تھی، منضبط کی جانے لگیں اور انہیں دوسرے صوتی قوانین کا پابند بنایا جانے لگا - مثلاً جرمانی زبانوں کے مصمتی تبادل کے کلیوں کی رو سے

سنسکرت، لاطینی اور سلاو ولتھونین "d" کو یونانی ٹ'ڈیلٹا'' اور جرمانی "t" کے مماثل سمجھا جاتا تھا لیکن یونانی '' دروتہ '' گاتھک '' دوہتر '' قدیم ہائی جرمن '' ٹوہتر '' کو مستثنیات میں شمار کیا جاتا تھا کیوں کہ سنسکرت میں یہ کلمہ '' ڈوہتہ '' اور ژند میں '' دغدہ '' تھا۔ لیکن **گراز مین** نے یہ ثابت کیا کہ سنسکرت کلمہ اصل ہند یورپی کلمے کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ وہ خود ہندیورپی '' دھوہتا '' سے ارتقا پاتا ہے اور ژند کلمہ ابتدا میں '' دھگدھا '' تھا۔ اس طرح اس نے مخلوط ہائیوں سے ہائیوں کے سقوط کا کلیہ پیش کیا۔ **کارل ورنر** نے **رلیسک اور گرم** کے قانون سے مستثنیٰ قرار پانے والی صوتی بے قاعدگیوں کی توجیہ کے لئے '' حنکی قانون '' پیش کیا۔ بہت سی صوتی بے قاعدگیوں کو لسانی اختلاط، دخیل اور مستعار کلموں کا نتیجہ بھی قرار دیا گیا۔ اور یہ خیال ظاہر کیا جانے لگا کہ صوتی تغیرات صوتی قوانین کی وجہ سے ہوتے ہیں یا قیاس تمثیلی کی وجہ سے۔

جہاں تک اصطلاح '' صوتی قوانین یا کلیے '' کا تعلق ہے، یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہیں طبعی یا عضویاتی قوانین کے مماثل قرار دینا درست نہیں۔ اس سے صرف یہ مراد لے سکتے ہیں کہ ایک خاص وقت میں ایک خاص زبان یا بولی میں ایک آواز مخصوص صوتی شرائط کے تحت دوسری آواز میں بدل جاتی ہے۔

یہ صوتی قوانین یورپی خاندان کی بعض زبانوں کے تقابلی مطالعے کے نتیجے میں ترتیب دیئے گئے تھے اور مطالعے کے لئے تحریری دستاویزوں کو پیش نظر رکھا گیا تھا۔ اور جدید

زبانوں کے صوتی نظام کو بنیاد بنا کر پچھلی زبانوں کے نمونوں کی صوتیات کو قیاس کیا گیا تھا۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئیے کہ قدیم زبانوں کی بیشتر اصوات واضح اور صاف نہیں تھیں - بہت سی آوازیں ایسی مخلوط اور مرکب تھیں کہ ان کی مختلف تعبیریں بھی ہوسکتی تھیں - انہیں جب مختلف شاخوں نے اپنی تحریروں میں منضبط کیا تو ان کے لئے کہیں کہیں علامتیں بھی مختلف ہوگئیں - کبھی تو ایسا بھی ہوا کہ ایک کلمہ ایک ہی زبان کے رسم الخط میں دو مختلف مکتوبی صورتوں میں پیش ہوا - اس کی مثالیں رگ وید اور دوسرے ویدوں میں بھی ملتی ہیں - سنسکرت ''ش'' کا تلفظ ''ش'' اور ''کھ'' کے درمیان تھا' ''س'' اور ''ہ'' ایک دوسرے سے مشابہ تلفظ رکھتے تھے - ''ی'' اور ''ج'' کی آوازیں ملتی جلتی تھیں - ''ر'' اور ''ل'' کی آوازوں میں امتیاز خاصا مشکل تھا - ''ت'' اور ''د'' کا فرق بھی بہت خفیف تھا - بعض میں ت اور ٹ کی آوازیں اور د اور ڈ کی آوازیں مشابہ تھیں - وقت کے ساتھ ساتھ مختلف شاخوں میں ان کے تلفظ زیادہ جلی اور واضح ہوتے گئے - ایک ہی زبان کی ایک مبہم اور دو آوازوں کی مخلوط سی آواز جب اس کی شاخوں میں دو مختلف آوازوں سے ادا کی گئی تو ان میں سے ایک کو قدیم تر سمجھ کر اصل آواز سے منسوب کردیا گیا - آوازوں کے اس قسم کے مدوجذر کی وجہ سے متشابہ آوازوں کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ کون سی قدیم تر ہے' بہت مشکل ہے -

مسلمہ صوتی کلیوں کا ایک اجمالی جائزہ بے محل نہ ہوگا - **گرم** کے قانون کو صوتیات کی تاریخ میں بہت اہمیت

دی جاتی ہے - اس قانون یا فارمولے کو اس طرح پیش کیا جاسکتا ہے -

یونانی	P	b	f	t	d	th	k	g	ch
گاتھک	f	p	b	th	t	d	h	k	g
ہائی جرمن	b (v)	f	p	d	z	t	g	ch	k

یا

یونانی	T	مجہورہ	M	A
		غیر مصمت		
گاتھک	A	ہائیہ	T	M
ہائی جرمن	M	مجہورہ	A	T
		مصمت		

گرم نے ہکار یا Aspirates کہہ کر مخلوط ہائیے (وقفیہ + ہائیہ)، وقفیہ + جاریہ ts 'pf - غیر مصمت جاریہ s'f - مصمت جاریہ y 'th اور ہائیہ h سبھی کچھ مراد لیا ہے - اور ہر جگہ تثلیث قائم رکھی ہے- دولبی (شفوی)، دندانی یا اسنانی اور حلقومی- شدیدہ، رخوہ، اور ہائیہ - یہ تثلیث مصوتوں میں بھی ہے 'a'i'u - جنس تعداد، ضمائر شخصی، زمانہ ان سب میں وہ تثلیث ہی کا قائل ہے -

اس میں شک نہیں کہ ہند یورپی زبانوں میں مصمت وغیر مصمت آوازوں کا تبادل باقاعدہ طور پر ملتا ہے پ'ب - ت'د - ک'گ باہم جگہ بدل لیتے ہیں - حلقی و حنکی آوازیں آپس میں بدل جاتی ہیں- مثلاً ک اور گ، چ اور ج سے جگہ بدل لیتے ہیں -

لاطینی اور ویدک میں دندانی یا اسنانی آوازیں لثوی یا مخی آوازوں میں بدل جاتی ہیں۔ ت اور د، "ٹ" اور "ڈ" میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ویدک زبانوں میں وقفیے، مخلوط ہائیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں یعنی ک گ، ج، چ کی جگہ کھ، گھ، جھ، چھ کی آوازیں لے لیتی ہیں۔ ہند یورپی میں y، اور j کی آوازیں متشابہ ہیں اس لئے ان کا تبادل ہو جاتا ہے۔ اس طرح "و" اور "ب" اور "س" اور "ہ" کی آوازیں بھی متشابہ ہیں، و کا ب میں تبادل اور س کی ہ میں تبدیلی عام طور پر ہوتی رہی ہے۔ پراکرتوں میں لثوی اور لثوی ہائیہ آوازوں، یعنی ٹ ڈ ڑ، ٹھ ڈھ ڑھ کا تبادل بھی ہوتا رہا ہے اور ل ن ر کا بھی۔ کبھی کبھی ک اور ب بھی ایک دوسرے کی جگہ لیتے ہیں۔

اردو میں سنسکرت کی غیر مصمت آوازیں، مصمت ہو جاتی ہیں۔ ک گ میں، پ ب میں، چ ج میں اور چھ جھ میں بدل جاتے ہیں۔ مثلاً لوک سے لوگ ولاک سے بگلا۔ کنچک سے کنجی "و" اردو میں "ب" بن جاتا ہے مثلاً وڈالکا سے بلی۔ وش سے بس۔ سنسکرت ت اور د کی آوازیں اردو میں ٹ اور ڈ سے بدل جاتی ہیں مثلاً تلک سے ٹیکا، در سے ڈر۔ سنسکرت، ت، اردو تک آتے آتے ٹ، ڈ کے مرحلے طے کر کے ڑ بھی بن جاتی ہے۔ مثلاً ات کھات سے اکھاڑ۔ پت سے پڑنا۔ مخلوط ہائیوں سے وقفیے گر کے صرف ہائیے رہ جاتے ہیں مثلاً میگھ سے مینہ۔ ابھیر سے اہیر۔ مکھ سے منہ۔ ش کا س سے اور س کا ہ سے تبادل ہو جاتا ہے مثلاً شوشر سے سسر۔ دوادش سے بارہ۔ "س" اور "ش" کی تبدیلی کبھی کبھی "چ" اور "چھ" میں بھی ہوتی رہی ہے۔ جیسے

"لالسا" "لالچ" بن گیا اور ششٹھ' "چھٹا"۔ سنسکرت "م" کا تبادل "و" سے ہوا اور اس کے پہلے مصوتہ مغنون ہوگیا مثلاً گرام سے گانو۔ آملک سے آنولا۔ کمل سے کنول ایسا تبادل آریائی زبانوں میں نہیں نظر آتا۔ "و" کا "م" سے تبادل بھی ملتا ہے جیسے لیب (نیو) سے لیم۔ یہ تبادل بھی آریائی یا ہند یورپی نہیں۔ سنسکرت آواز "کش" کی جگہ "چھ" بھی لے لیتی ہے اور "کھ" بھی۔ سنسکرت اور پراکرت کے بہت سے کاموں کی بعض اصوات اردو میں کچھ اس طرح بدل جاتی ہیں کہ ان سب کو مخصوص قاعدوں کے ذیل میں لانا مشکل ہے۔ تاہم ہر قسم کی تبدیلی کے ذیل میں چند مثالیں ضرور مل جاتی ہیں۔ عربی، فارسی اور انگریزی کے مستعار الفاظ میں بھی صوتی تغیرات ہوجاتے ہیں نقد کو نگد، جیکیب آباد کو جیکم آباد بھی کہا جاتا ہے۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ بہت سے صوتی تغیرات قیاسی ہوتے ہیں یا ان کی اساس قیاس تمثیلی ہو ہوتی ہے۔ **ہرمین پال** نے قیاسی تشکیلوں کو تناسب کے فارمولے ا : ب — ج : نامعلوم کے ذریعے پیش کیا ہے، جس میں تین ہئیتیں معلوم ہوتی ہیں اور چوتھی قیاس سے مستنبط ہوتی ہے اردو میں یہ مثال پیش کی جاسکتی ہے کھیلنا : کھیلا — چلنا : لا (چلا)۔ لیکن اس فارمولے پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ بہت سی قیاسی تشکیلوں کی توجیہ مختلف آزاد صوتی مواد یا عناصر کی براہ راست ترکیب سے بہتر طور پر ہوسکتی ہے، ان کے لئے متناسبہ ہئیتیں پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں مثلاً

یہ کہنے کے بجائے کہ men's نتیجہ ہے اس فارمولے کا man : man's – men : لا (men's) یہ توجیہ کی جا سکتی ہے کہ men میں جمع کی علامت 's بڑھادی گئی ہے۔ **گراف** کا یہ خیال صحیح ہے کہ قیاس تمثیلی نے پہلے بھی نئی نئی تشکیلوں کو جنم دے کر زبان کے سرمائے میں اضافہ کیا ہے اور اس کی بدولت زبان ارتقائی سفر طے کرتی رہی ہے اور آئندہ بھی وہ زبان کے ارتقا میں اہم کردار ادا کرتی رہے گی۔ بعض انتہا پسند قیاس تمثیلی کو ایک قوت قرار دیتے رہے ہیں، ایسی قوت جو پہلے سے موجود رہنے والی ہیئتوں کی مماثل ہیئتیں تخلیق کراتی ہے۔ قیاس تمثیلی تو محض مشابہت کی ایسی حقیقت ہے، بولنے والے جس کا ادراک کرتے ہیں۔ اس مدرکہ حقیقت کا رد عمل، بولنے والا پر کیا ہوتا ہے؟ یہ سوال البتہ اہمیت رکھتا ہے۔ اگر رد عمل ہمیشہ اور التزاماً ایک ہی رخ پر ہو اور ایک ہیئت صوتی اعتبار سے دوسری سے مشابہ ہو تو ہم معنوی مشابہت کو بھی وجہ قرار دے سکتے ہیں۔ معنوی یا تفاعلی قیاس صوری ہمواری کا نتیجہ بھی ہوتا ہے۔ اور اس کے برعکس بھی ہوسکتا ہے۔ در اصل لسانی تبدیلی کے عمل میں متضاد رجحانات کار فرما ہوتے ہیں، ایک مشابہت اور یکسانیت کا رجحان اور دوسرا فرق وامتیاز کا۔ ان میں توازن کیوں کر پیدا ہوتا، ہے، کب ایک رجحان غالب آجاتا ہے اور کیوں غالب آتا ہے، ان سوالات کا جواب دینا مشکل ہے۔ ہاں ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ لسانی تغیرات میں سے بیشتر کو انھی بنیادی رجحانات میں سے کسی ایک سے منسوب کرسکتے ہیں۔

قیاس تمثیلی سے منسوب ہونے والا ہر تغیر یکسانیت اور مشابہت کے رجحان کا مظہر ہوتا ہے - لیکن میکانکی صوتی تغیرات کو فرق وامتیاز کے رجحان کا نتیجہ قرار نہیں دیا جاسکتا موخرالذکر رجحان dissimilation اور dipthongization کا باعث ہوتا ہے - dissimilation سے مراد ایسا عمل جو کلمے کی دو مشابہ آوازوں کو، خواہ وہ متصل ہوں یا ایک دوسرے سے شور، ایک دوسرے سے مختلف بنادے اس میں کوئی ایک آوازا بدل جاتی ہے مثلاً لاطینی کلمے Lappis 'Lapsee - dipthongization سے مراد مصوتوں کو ملواں بنا دینا- اردو میں یہ عمل گوارا نہیں کیا جاتا اور الذکر عمل assimilation یا مصمتی جنسیائی یا انجذاب اور مصوتے کو اکہرے کرنے monop thongization کا موجب- قیاس تمثیلی کی صوتی ہمواری کا عمل اور صوتی قوانین یا کلیوں کا عمل، اگرچہ دو مختلف مظاہر ہیں لیکن عام طور پر ان کی ''ٹائپ'' ایک ہی ہوتی ہے- قیاس تمثیلی کو محض صوتی مماثلت یا معنوی مشابہت تک محدود نہیں کیا جاسکتا - اس کی بنیاد صوتی مماثلت پر بھی ہوسکتی ہے اور معنوی مشابہت پر بھی، نحوی یکسانیت پر ہوسکتی ہے اور صرفی مماثلت پر بھی - اگر کسی مرکب یا مشتق کلمے پر سے قیاس کرکے کلمہ وضع ہوا ہے تو اس کی دوصورتیں ہوں گی - ایک یہ کہ تغیر مستقل کلمے میں کیا گیا ہو، دوسری یہ کہ تبدیلی لاحقے یا تعیری جزو میں ہو - پہلی صورت کو اساسی یا اصلی Material اور دوسری کو تعمیری یا رسمی یا formal کہا جاتا ہے -

لسانی اور صوتی تغیرات کے اسباب - لسانی اور

صوتی تغیرات کے سلسلے میں یہ سوالات ابھرتے رہے ہیں کہ آخر یہ تغیرات ہوتے ہی کیوں ہیں ؟ یہ تغیرات کبھی ایک صوتی رخ اور کبھی بالکل مختلف صوتی رخ پر ہی کیوں ہوتے ہیں ؟ ان تغیرات کی باقاعدگی اور عمومیت کی کیا وجہ ہے ؟ ایک ہی دور یا ایک ہی زبان میں یہ تغیرات کم اور نسبتاً سست کیوں ہوتے ہیں اور دوسرے دور میں اسی زبان یا کسی دوسری زبان میں زیادہ اور تیز کیوں ہوتے ہیں ؟ بہت سے ماہرین نے ان سوالات سے سیر حاصل بحث کی ہے اور اس طرح بہت سے نظرئیے منظر عام پر آئے ہیں -

آب و ہوا اور جغرافیائی کوائف - کچھ ماہرین نے آب و ہوا یا جغرافیائی کوائف کو لسانی تبدیلوں کا عام سبب اور صوتی تبدیلوں کی خصوصی وجہ بتلایا ہے - ان کی یہ رائے ہے کہ جغرافیائی سختیوں کو برداشت کرنے والی قوموں کی آوازوں اور لب و لجہ پر ماحول کا بالواسطہ اثر پڑتا ہے - وہ پہاڑی علاقوں اور جنگلوں کے باشندوں کی زبانوں سے مثالیں بھی پیش کرتے ہیں مثلاً کاکیشیا کے پہاڑی اور دشوار گزار علاقے کی زبان میں مصمتے کریہہ اور ثقیل ہیں اور لوگوں کا لب و لہجہ درشت ہے - **ڈورک** قوم (Doric) کی لسانی کرختگی، ان کے مرزبوم **لے کونیا** (Laconia) کی جنگلی اور پہاڑی زندگی کا نتیجہ ہے - **آئونین** قوم کی لسانی نرمی، ایشیائے کوچک کے ساحلوں کی خوشگوار اور ساز گار آب و ہوا کا کرشمہ ہے - جرمن سوئس بولیوں کی کرخت حلقی آواز " خ " (ch) طبعی حالات اور آب و ہوا کے زیر اثر ہے -

یہ خیال بھی ظاہر کیا جاتا رہا ہے کہ انگریز جزائر برطانیہ کی کہر آلود فضا کی وجہ سے مصوتوں کو تیے ادا کر وقت منہ کھولنے سے کچھ گھبراتے ہیں۔

آب و ہوا، جغرافیہ، خصوصاً ہوا کے دباؤ اور طرز معشت کا تھوڑا بہت اثر اصوات پر ہوتا تو ہے لیکن اس اثر کو ایک کلیے کی حیثیت دے دینا درست نہیں۔ یہ درست ہے کہ بعض پہاڑی علاقوں کی زبانوں میں کریہہ اور سخت آوازیں نسبتاً زیادہ ملتی ہیں لیکن بعض میدانی علاقوں اور ان سرزمینوں میں بھی جہاں، زندگی کی آسائشیں آسانی سے میسر آجاتی ہیں، اور جہاں کی آب وہوا خوش گوار ہے، زبان کے مصمتوں میں کچھ کرختگی بھی پیدا ہو جاتی ہے مثلاً امریکہ کے شمالی مغربی ساحل کی اب و ہوا خاسی اچھی ہے اور زندگی کی آسائشیں بھی میسر ہیں، لیکن باشندوں کی صوتی کرختگی کا کیشیا کے رہنے والوں سے کم نہیں۔ اس کے برعکس اسکیمو بڑی مشقت کی زندگی بسر کرتے ہیں پھر بھی ان کی زبان میں اچھی خاصی نرمی ملتی ہے۔

صوتی تبادل کا جغرافی نظریہ پہلی بار بنفے (Benfy) نے ۱۹۰۱ء میں پیش کیا تھا۔ Coltz نے اس کی تائید کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ ''مصیت کی غیر مصیت ہیں غیر مصیت کی جاریہ یا ہانیہ یا ہکار میں تبدیلیاں ایک قسم کا اشتراک ضرور رکھتی ہیں اور وہ ہے نفسی سبب یعنی ان سب تبدیلیوں میں سانس کے دباؤ میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور ہوتا ہے۔ اور یہ اضافہ جغرافیائی ماحول کے زیر اثر ہوتا ہے''۔ (بحوالہ یسپرسن)

اس میں شک نہیں کہ بلند مقامات میں پھیپھڑوں پر دباؤ زیادہ پڑتا ہے لیکن مصمتوں کی آواز کا براہ راست تعلق پھیپھڑوں سے نہیں ہوتا بلکہ اعضائے نطق سے ہوتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک جیسی آب و ہوا کے خطوں میں بھی آوازوں کا ارتقا مختلف سمت میں ہوتا ہے، بعض جگہ آوازیں نرمی کی طرف مائل ہوتی جاتی ہیں اور کہیں کہیں سختی یا کرختگی کی طرف۔ تاہم یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ کبھی کبھار زبانیں آب و ہوا یا جغرافیہ سے متاثر ہوتی ہیں لیکن یہ تاثرات خفیف سے ہوتے ہیں اور بالواسطہ لیکن ان کی وجہ سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ اثر التزاماً پڑتا ہے۔

تغیرات اور اعضائے نطق۔ یہ نظریہ بھی عام رہ چکا ہے کہ اعضائے نطق میں فرق پڑ جائے یا ان میں غیر معمولی تبدیلی ہوجانے کی وجہ سے زبان میں صوتی تغیرات ہوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ دانتوں کی غیر معمولی بناوٹ سے اسنانی یا صفیریہ آوازوں میں فرق پڑسکتا ہے اور موٹے اور موٹے ہونے ہونٹوں کی وجہ سے شفوی (لبی) آوازیں متاثر ہوسکتی ہیں لیکن اعضائے نطق کی یہ حالتیں غیر معمولی ہوتی ہیں اور عام اور نارمل انسانوں کے اعضائے نطق ایسے نہیں ہوتے۔ یوں جن قبائل میں سامنے کے دانت نکلوا دینے یا ہونٹوں کو غیر معمولی چپٹا کر لینے یا ان میں زیور پہننے کی رسم رہی ہے، ان میں آہستہ آہستہ اسنانی یا شفوی آوازیں خصوصی بدل گئیں یا ناپید ہوگئیں یاؤ قبیلے کی عورتیں اوپر کے ہونٹ میں لکڑی کا چھوٹا سا قرص پہنے

کی عادی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ”f“ کی آواز نہیں نکال سکتی تھیں اور اپنی اولادوں کو اس آواز کی ادائیگی نہ سکھا سکیں - رفتہ رفتہ یہ آواز ان کی زبان سے مٹ گئی - لیکن مستعار کلموں کے ذریعے یہ آواز بعد میں زبان کا جزو بن گئی —

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ زبان میں صوتی تغیرات کی وجہ سے کوئی بالکل نئی آواز زبان پر پیدا نہیں ہوجاتی - بلکہ موجود آوازیں دوسری موجود آوازوں میں بدل جاتی ہیں یا مستعار کلموں کی ایسی آوازیں جو زبان میں موجود نہیں ہوتیں تھوڑی بہت تبدیلی یا قریب المخرج آواز کی صورت میں ضرور پیدا ہوجاتی ہیں —

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جغرافیہ، اور آب و ہوا کے اختلاف سے یا نسلی امتیاز کی وجہ سے مختلف قوموں کے اعضائے نطق کی بناوٹ میں بھی تھوڑا بہت اختلاف ہوتا ہے - اسی لئے ان کی زبانوں میں تمام آوازیں مماثل نہیں ہوتیں - غالباً یہی وجہ ہے کہ بنوی ہند یا دکن کا باشندہ ”ق“ کی صحیح آواز نہیں نکال سکتا، بجائے ”ق“ کے ”خ“ کی آواز نکالتا ہے- ایرانی ”غ“ کی آواز نکالتا ہے اور آقا، قران، معقول و منقول کو آغا، غران، مخغول و منغول کہتا ہے - بلوچ ”روز“ کو ”روچ“ کہے گا، رخشانی اور مشرقی بلوچی میں بعض مصمتوں کی آوازیں متنازعہ فیہ ہیں - لیکن اس قسم کے اختلافات کو اعضائے نطق کی بناوٹ کے اختلافات پر محمول نہیں کرنا چاہئے کیوں کہ اب تک یہ ثابت نہیں ہوسکا ہے کہ مختلف

قوموں کے عام آدمیوں کے اعضائے نطق بناوٹ کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ بات در اصل یہ ہے کہ ہر زبان کے استعمالی اصوات کے اپنے قاعدے ہوتے ہیں اور زبان بولنے والا اسی کا عادی ہوجاتا ہے۔ مادری زبان کا صوتی نظام تحت الشعور میں ایسا رچ بس جاتا ہے کہ اس کی سماعت تقریباً اسی تک محدود ہوجاتی ہے اور جب وہ نئی زبان کا کوئی ایسا کلمہ سنتا ہے جس کی کوئی آواز اس کی اپنی مادری زبان میں مفقود ہوتی ہے تو اس کی سماعت قریب المخرج آواز سنواتی ہے اور جب جب وہ اس کلمے کو ادا کرتا ہے تو غیر شعوری طور پر اجنبی آواز کی جگہ قریب المخرج آواز ہی نکالتا ہے' اس کے دوسرے ساتھی اور دوسری نسلیں بھی اسی طرح کے تصرف کے بعد اس کلمے کا تلفظ ادا کرتی ہیں۔ لیکن بچے جن کی صوتی عادتیں راسخ نہیں ہوتیں ان اجنبی آوازوں کو صحیح سن کر صحیح ادا کرسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بڑوں کے مقابلے ہر بچے نئی زبانیں جلد سیکھ لیتے ہیں۔

قومی نفسیات۔ بعض ماہرین لسانیات کا یہ خیال ہے کہ ایک زبان کے صوتی تغیرات کی توجیہ کے لئے اس زبان کو بولنے والی قوم کی نفسیات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ جیکب گرم (J. Grimm) کے عہد سے یہ خیال عام ہونے لگا کہ جرمن زبان کے مصمتی تبادل کا سبب جرمنوں کی نفسیت میں تلاش کرنا چاہیئے۔ گریم نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ جرمن زبان کا صوتی تبادل جرمنوں کی آزادی کی امنگ اور ترقی پسند رجحان کا نتیجہ ہے۔ جرمانی قوموں کو اپنے قبائل کی ہجرت

کے دور اور اپنی بہادری پر بڑا فخر تھا، اس لئے ان کی حرکی نفسیات کی وجہ سے ان کی زبانوں میں صوتی تبادل ہوا لکن ان میں سے گاتھک، سیکسن اور اسکنڈی نیوی قبائل کی زندگی میں ٹھہراؤ اور مدنیت پیدا ہونے کی وجہ سے قومی نفسیات خاصی بدل گئی اور ان قبائل نے پہلے مصمتی تبادل ہی پر اکتفا کرلیا اس کے برعکس جرمن قبائل کسی قدر وحشی ہی رہے اور ان کی حرکی نفسیات پہلے تبادل سے مطمئن نہیں رہ سکی اس لئے جرمن زبان میں دوسرا صوتی تبادل بھی ہوا"۔ **کرئی س** (Curtius) جرمانی اصوات کے تبادل میں ایک طرح کی نوخیز توانائی محسوس کرتا ہے۔ **ملینخوف** (Mullenhof) کا یہ خیال ہے کہ p 't 'k کی h'th 'f میں تبدیلی ایک طرح کے ضعف کی آئینہ دار ہے۔ جرمن سخت بندشی یا وقفیہ آوازوں کے تلفظ سے قاصر ہورہے تھے۔ gh 'dh 'bh 'kh 'th 'ph ہکار آوازوں کا متروک ہوجانا بھی جرمنوں کی کمزوری، آرام طلبی اور کاہلی پر دلالت کرتا ہے لیکن b، d' g کا p' t' k میں تبادل یہ ثابت کرتا ہے کہ ان میں نئی توانائی پیدا ہوگئی۔ **شیورر** نے صوتی تبادل کو جمالیاتی نقطہ نظر سے دیکھا ہے۔ اس کی یہ رائے ہے کہ دوسرے مصمتی تبادل کا سبب یہ ہے کہ جرمن نفسیات میں جمالیاتی پہلو غالب آنے لگا تھا۔

گویا جرمانی صوتی تبادل کو مخصوص قومی نفسیات کا کرشمہ سمجھ لیا گیا تھا ایسی نفسیات جو تبادل کے وقت کارفرما فرض کرلی گئی تھی۔ لیکن اصوات کے مخصوص تلفظ اور اصوات ادا کرنے والوں کی ذہنی حالت اور نفسیات کا باہمی

رشتہ سائنسی طور پر دریافت کرنا ممکن نہیں اور یہ اجتماعی نفسیات کے مدوجذر کے صحیح علم کا کوئی پیمانہ بھی تو نہیں۔

تسہیل یا تقلیل محنت۔ تسہیل یا تقلیل محنت کو کو بھی صوتی تغیرات کا سبب قرار دیا جاتا ہے اس نظریئے پر بحث کرتے وقت یہ طے کرنا ضروری ہوجاتا ہے کہ آیا صوتی تغیرات کا رخ واقعی صوتی تسہیل کی طرف ہوتا ہے اور کیا ان تغیرات سے کوشش کی کفایت کے رجحان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ **وھٹنی** کی یہ رائے ہے کہ "عام رجحان یہ ہوتا ہے کہ بولتے وقت اعضائے نطق کو سہولت ہو اور بات چیت کرتے وقت کم سے کم وقت اور کم سے کم محنت صرف ہو۔ **کرٹی اس** کا خیال ہے کہ تسہیلی رجحان اور اعضائے نطق کی سہولت کا خیال فطری بات ہے لیکن بعض ماہرین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ بعض نئی آوازیں پرانی آوازوں کے مقابلے ہر مشکل ہوتی ہیں۔ اہل زبان اپنی زبان کی کسی آواز کو مشکل نہیں سمجھتے خواہ دوسری زبان بولنے والے ان کی زبان کی بعض آوازوں کو کتنی ہی مشکل سمجھیں ہمیں یہ ذہن نشین کرلینا چاہئیے کہ ہمیں انفرادی آوازوں کی سہولت یا دشواری کو پیش نظر نہیں رکھنا ہے بلکہ ان کو دوسری آوازوں کے سیاق میں پرکھنا ہے زبان میں صوتی جنسیائی یا انجذاب کا عمل بھی کارفرما ہوتا ہے اور اس عمل سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نطق کی سہولت اور صوتی کفایت کا رجحان اس کا موجب ہے۔ اصوات کے ایجاز و اختصار کے کرشمے آئے دن سنائی دیتے ہیں۔ کراچی

میں ''گاندھی گارڈن'' کو گارڈن ہی کہا جاتا رہا ہے۔ شارع محمد علی جناح کو جناح روڈ کہنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ''ممتاز''۔ ''زبیدہ'' فیروز۔ غلام محمد۔ عام بات چیت ہیں (خصوصاً پنجاب میں) تاجی بدان۔ پھوجا۔ گاماں بن جاتے۔ افراط و تفریط'' کی جگہ ''افراتفری'' کہنے کا رجحان عام ہے۔ ''ہٹ تالا'' نے ہڑتال کی صورت اختیار کرلی اور ''زیب ور'' زیور بن گیا۔ صوتی تراش خراش، بھی تسہیلی رجحان کی غماز ہے۔ جدید ہند آریائی زبانوں میں سنسکرت کے جو ''تدبھو'' استعمال ہوتے ہیں، ان کی اصل اور ارتقائی منزلوں اور تغیرات کی نہج پر غور کیجئے۔ ''دھوترکا'' ''نے'' ''دھوترا'' کا روپ دھارا اور پھر سیدھی سادی ''دھوتی'' بن گئی۔ ''چھترکا'' نے ''چھتری'' کی پناہ ڈھونڈی۔ ''راجکا'' سمٹی تو ''رانی'' بن گئی۔ ''یوکترکا'' روانی اختیار کی تو ''جوڑی'' کا ظہور ہوا۔ ''کیدارکا'' نے سلاست کا سہارا لیا تو بتدریج ''کیاری'' بن گئی۔ ''کاش ٹھکا'' میں روانی پیدا کی گئی تو ''کاٹھی'' تیار ہوئی۔ ''وینڑیجا'' کہہ کر اعضائے صوت کب تک تھکائے جاتے، ''بنیا'' نے صوتی سہولت بخشی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ یہ سہولت بھی ''واتیو'' کی منزل سے آئی۔ ''کدیالا'' کی صوتی رکاوٹ ''کاجل'' سے دور ہوئی۔ ''پانچاونشتی'' اور ''سپت و نشتی'' کو آخر کار پچیس اور ستائس کہنا پڑا، کچھ صوتی منزلوں سے گزر کر ہی سہی۔

توارث ـــ ۱۹۲۷ء میں جتنیکین (Jocob J. A. van Ginneken) نے صوتی تغیرات سے متعلق

ایک دل چسپ نظریہ پیش کیا ہے جس کی رو سے صوتی تغیرات اور ان کی باقاعدگی حیاتیاتی توارث کا معمولی مظہر قرار پاتی ہے - اس کی یہ رائے ہے کہ گویائی کی بنیاد، عضویاتی ساخت اور نفسیاتی رجحانات کی ایک طرح کی ترکیب پر ہوتی ہے اور یہ دونوں امکانات کے انہی اصولوں اور فارمولوں کے مطابق ورثے میں ملتے ہیں جن کے تحت حیاتیاتی خصائص کا ورثہ ملتا ہے- وہ مشابہت یا مماثلت جس کی اساس توارث ہے ہمیشہ اضافی ہوتی ہے اور مکمل یا بعینہ مماثلت کی نمائندگی نہیں کرتی- رونما ہونے والے اختلافات کو ماہرین حیاتیات نے تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے- (۱) خارجی یا مظاہراتی تغیر و تبدل (۲) تبدیلی نوع (۳) پیوندی تبدیلیاں-

(۱) ایک جیسی توراثی خصوصیات رکھنے والے افراد پر خارجی ماحول کے جو مختلف اثرات پڑتے ہیں، اُن سے ان افراد میں کچھ تغیر و تبدل ہو جاتا ہے کیوں کہ ورثے میں ملنے والے مزاج کے مقابلے پر یہ اثرات زیادہ موثر ہوتے ہیں- ماں اور باپ دونوں دق کے مریض ہوں تو ان کے بچوں کو یہ مرض ورثے میں مل جاتا ہے لیکن جسمانی حالت پر ماحول کے مختلف اثرات کی وجہ سے بعض اپنے والدین کی طرح مریض نہیں ہوتے لسانی حقائق بھی حیاتیاتی مواد کے مماثل ہوتے ہیں- کسی زبان یا بولی کی نمایاں خصوصیت انداز گویائی، لب و لہجہ یا اعضائے نطق کے مخصوص استعمال سے متعین ہوتی ہے اور یہ خصوصیت ایک نسل اپنی پیش رو نسل سے سیکھتی ہے- نطقی توارث ایک یا کئی بنیادی نطقی رجحانات کا نتیجہ ہوتا ہے- **مارس گریمونٹ** (Maurice Grammont) نے یہ ثابت کیا ہے کہ قدیم انڈین

میں صوتی تغیر تالو کے درمیانی حصے پر نطقی زور دینے کے رجحان کا نتیجہ ہے - فرانسیسی کے صوتی نظام میں منہ کے سامنے کے حصے کی طرف نطقی عمل کو بڑھانے کا رجحان ملتا ہے - نطقی رجحانات لبی (شفوی) بھی ہوسکتے ہیں اور دندانی (اسنانی) بھی - کوزی یا مخی (لثوی) بھی ہوسکتے ہیں اور حلقی بھی - جن کے ان گنت امتزاج و ترکیب سے زبانوں، بولیوں، بلکہ افراد کے نطق اور لب و لہجہ کی مخصوص بنیادیں تشکیل پاتی ہیں - انہی کی وجہ سے زبانوں میں وہ صوتی تغیرات ہوتے ہیں جنہیں خود اختیاری کہا جاتا ہے مثلاً ایک آواز کا اپنی متصل آوازوں کا اثر لئے بغیر حنکی آواز میں بدل جانا خود اختیاری ہی کہلائے گا - یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک رجحان بہت سے مختلف تغیرات کا موجب بن جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ بہت سے رجحانات ایک ہی خصوصیت پیدا کرنے کے باعث ہوں —

(۲) حیاتیاتی دنیا میں کبھی کبھی نوع غیر متوقع طور پر تبدیل ہوجاتی ہے ایک نسل کے افراد میں پچھلی نسل کی حیاتیاتی خصوصیات میں سے کچھ کی تبدیلی کے بجائے انقلاب نوعی بھی آجاتا ہے - اسی طرح زبان میں بھی کبھی کبھی کوئی صوتی تغیر خود بخود اور اچانک ہوجاتا ہے اور اس کو تدریجی ارتقا کا نتیجہ اور پچھلی کسی آواز کی ذیلی تبدیلی سمجھنا ممکن نہیں ہوتا - یہ تغیر آس پاس کی اصوات کے زیر اثر نہیں ہوتا - صدیوں کے لسانی مواد کے تقابلی مطالعے سے ارتقائی منزلوں اور تغیر کی ابتدا ہی کا علم نہیں ہوتا بلکہ یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ ان صوتی تغیرات کے علاوہ، جو لسانی

اختلاط کا نتیجہ ہیں، جو اختیاری تغیرات ہوتے ہیں وہ مختلف قسم کی، تبدیلیوں خصوصاً صوتی انجذاب کے طفیل ہوتے ہیں اور انجذاب یا ترمیم کا عمل ایک ہی رخ پر سالہاسال تک ہوتا رہتا ہے۔ پھر ایک دور ایسا آتا ہے کہ صوتی ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے لیکن کچھ عرصے کے بعد اچانک ویسا ہی تغیر ہوتا ہے گویا صوتی نوع میں انقلاب آگیا ہو۔ مثلاً انگریزی کے اینگلو فریسین دور میں [k] حنکی مصوتوں سے پہلے خود حنکی ہوجاتا ہے اور حنکی مصوتے حذف ہوجاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ عمل رک جاتا ہے اور پھر تین سو سال بعد اینگلو سیکسن میں [k] پھر حنکی ہو جاتا ہے اور اس طرح جیسے تدریجی ارتقا کے طور پر نہیں بلکہ اچانک ہو۔

(۳) جس طرح نسلی اختلاط کے نتیجے میں نسلی طور پر پیوندی تغیرات ہوتے رہتے ہیں، اسی طرح زبان میں بھی پیوندی تغیرات ہوتے ہیں۔ مختلف زبانوں اور سوشل گروہوں کی سرحدوں پر اس کے کرشمے زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ السانچی (Alsace) قوم کے جو لوگ جرمن بولنے والے ہیں وہ فرانسیسیوں کی طرح مصوتوں کو انفیا کر مغنہ ن بنالیتے ہیں اور جو فرانسیسی بولنے والے ہیں وہ جنوبی جرمنوں کی طرح مصیت آواز کو غیر مصیت کر لیتے ہیں۔ اس طرح کے اختلاط یا قرب کی وجہ سے دو مختلف زبانوں کی بعض اصل آوازیں مخلوط زبان میں قائم رہ جاتی ہیں اور بعض ایک دوسرے پر اثر انداز ہو کر نئی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اس طرح [y] اور [q] جو دندانی اور لبی کا امتزاج ہیں [i] اور [e] میں بدل جاتی ہیں۔ ہسپانوی میں دندانی

لبی [v] اور [f] دولبی [b] اور [(f)h] میں تبدیل ہوجاتی ہیں - قدیم ترین جرمانی میں کامے کا ابتدائی نقرہ ہند یورپی اور غیر ہند یورپی اقوام کے اختلاط کا نتیجہ تھا۔ جرمانی صوتی تبادل کو دوسری اقوام سے لئے ہوئے مستعار رجحانات کا کرشمہ قرار دیا جاتا ہے -

نسلی اختلاط - نسلی اختلاط کے عوامل' ان کی نوعیتیں اور ان کے لسانی نتائج ایک سے نہیں ہوتے - **یسپرسن** نے **جارج ہمپل** کے حوالے سے نسلی اختلاط کی حسب ذیل صورتوں پر روشنی ڈالی ہے :-

(۱) فاتحین نسبتاً عددی اقلیت میں ہوتے ہیں - اگر چہ وہ حکمران ہوتے ہیں تاہم وہ مفتوحہ علاقے پر اپنی زبان مسلط نہیں کرسکتے - انہیں مفتوحین کی زبان سیکھنی پڑتی ہے - ان کی اولادیں آباواجداد کی زبان کے مقابلے پر ملکی زبان پر زیادہ دسترس رکھتی ہیں - فاتحین کی زبان آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے لیکن اپنی باقیات الصالحات چھوڑ جاتی ہے - حکومت اور عسکری معاملات اور مفتوحین کے زیر اثر شعبہ ہائے زندگی سے متعلق کامے اور اصطلاحیں ملکی زبان کو ودیعت کرجاتی ہے - تاریخی مثالوں میں اٹلی اور اسپین کی گاتھ قوم' **گال** کی فرانک قوم - فرانس کی نارمن قوم اور انگلستان کی نارمن فرنچ قوم کو پیش کیا جاسکتا ہے -

(۲) (ا) حملہ آور کئی گروہوں کی صورت میں کسی ملک

میں یکے بعد دیگرے پہنچتے ہیں اور وہاں آباد ہو کر آہستہ آہستہ زندگی کے تمام شعبوں پر مسلط ہوجاتے ہیں۔ ملکی باشندے بڑی تعداد میں بھاگ نکلتے ہیں اور جو بچ رہتے ہیں وہ غلامانہ زندگی بسر کرتے ہیں، ان کی زبان حقیر سمجھی جاتی ہے۔ اس زبان کے وہ کلمے جن کا تعلق نچلے پیشوں اور ملک کی مخصوص اشیا اور جگہوں سے ہوتا ہے، فاتحین کی زبان میں بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً برطانیہ میں اینگلس قوم اور سیکسن قوم کے اختلاط کے نتیجے میں یہی کچھ ہوا۔ امریکہ اور آسٹریلیا میں یورپی قومیں پہنچیں تو کم و بیش یہی کچھ ہوا مفتوحین کی زبانیں پس منظر میں چلی گئیں اور برائے نام باقی رہ گئیں۔

(۲) (ب) ایک طاقتور قوم کسی علاقے کو فتح کرتی ہے تو نہ صرف حاکم اور فوجی اپنے ملک سے درآمد کرتی ہے بلکہ تاجر اور نو آباد کار بھی بلالیتی ہے اگر یہ سیاسی تسلط سالہاسال تک رہتا ہے تو ملکی باشندے ان کی نقالی کرنے لگتے ہیں۔ یہ نقالی رہن سہن کی بھی ہوتی ہے اور زبان کی بھی۔ رومنوں کے ما تحت اٹلی، اسپین اور گال کا بھی حال رہا۔ مشرقی جرمنی کی سلاوی قوم اور نیویارک اسٹیٹ کی ڈچ قوم کی بھی کیفیت رہی۔

(۳) ہجرت کرنے والے گروہ درگروہ مختلف اوقات میں کسی ملک میں پہنچتے ہیں۔ وہ وہاں معمولی کاروبار میں لگ جاتے ہیں۔ وہ اپنے مفاد کے پیش نظر اپنے ہم قوموں کے مقابلے ہر ملکی سے زیادہ میل ملاپ بڑھاتے ہیں، ان کی زبان سیکھتے ہیں۔ ان کی پاشندوں اولاد آباواجداد کی زبان یکسر ترک کردیتی بلکہ ان کے

لب و لہجہ سے بچنے کی کوشش کرتی ہے اور ملکی زبان کا مقامی لب و لہجہ اختیار کرتی ہے۔

پہلی اور تیسری صورت میں مفتوحین کی یا ملکی زبان غالب آجاتی ہے۔ دوسری صورت کی دونوں شقوں میں فاتحین کی زبان غالب رہتی ہے۔ (۲) ب کے سوا تمام صورتوں میں اکثریت کی زبان غلبہ پاتی ہے۔ تیسری اور پہلی صورت میں اقلیت اکثریت کی زبان سیکھتی ہے تو اپنی صوتی عادت کی وجہ سے نامانوس آوازوں کی جگہ اپنی زبان کی مانوس آوازیں اور لہجہ غیر شعوری طور پر استعمال کرتی ہے، خواہ اقلیت فاتح ہو یا مفتوح۔ تیسری صورت میں جس میں پوری آبادی اپنی زبان چھوڑ کر فاتحین کی زبان اختیار کرتی ہے، صوتی تبادل خاص طور پر نمایاں نظر آتا ہے۔ برصغیر کی تاریخ سے نسلی اختلاط کے نتیجے میں لسانی تغیرات کی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں دراوڑوں کی آمد کے بعد کوئی سنتھال قوموں کی حیثیت، دونوں کی زبانوں کے باہمی اثرات۔ آریاؤں کی آمد، دراوزوں کا جنوبی علاقوں میں سمٹ کر رہ جانا، شمالی علاقوں میں دراوڑوں کی مغلوب حیثیت، ویدک زبان میں کول دراوڑ کلموں کا راہ پانا۔ پراکرتوں کا ارتقا سنسکرت کلموں کی صوتی تبدیلیاں اور تدبھو کی حیثیت اختیار کرنا۔ سنکرت پر غیر آریائی اثرات۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد اب بھرنشوں پر فارسی ترکی وغیرہ کے اثرات، جدید ہند آریائی کا ارتقا ان زبانوں میں سنسکرت، غیر آریائی، فارسی، ترکی کے اثرات کی وجہ سے ارتقا کا ایک نیا رخ۔ ان سب کا مطالعہ نسلی اختلاط زبانوں کے تال میل، اور لسانی تغیرات کے تمام گوشے نظر کے سامنے لے آتا ہے

رومن شہنشاہیت کے زیر تسلط جو ممالک رہے ہیں ان کے سرکاری اور تعلیمی شعبوں پر لاطینی کی سخت گرفت رہی ہے لیکن تیسری صدی عیسوی میں سیاسی واقعات نے اس غلبے کا طلسم توڑ دیا - اور عوامی زبانیں فطری ارتقا کی منزلیں آزادی کے ساتھ طے کرنے لگیں اور اس طرح رومانی (Romanic) زبانیں لاطینی سے خاصی دور ہوتی گئیں - زبان اور قوم یا نسل کو لازم ملزوم سمجھنا درست نہیں - رومانیہ میں مختلف نسلیں آباد ہیں لیکن ان سب کی زبان ایک ہے، بولیوں کا اختلاف بھی نہیں - پاکستان کے مختلف صوبوں میں مختلف نسلیں آباد ہیں لیکن لسانی اختلافات کلی طور پر نسلی بنیاد پر نہیں -

دخیل کلمے - زبانوں کے اختلافات اور صوتی تغیرات

میں نسلی اختلاط کے نتیجے میں رونما ہونے والے صوتی تبادل کا کردار جو کچھ بھی رہا ہے، اس سے کہیں زیادہ کردار ان کلموں کا ہوتا ہے جو ایک زبان دوسری زبانوں سے لے لیتی ہے جنھیں لسانیات کی اصطلاح میں Loan words کہا جاتا ہے - جس کا ترجمہ "مستعار کلمات" کیا جاسکتا ہے لیکن اس ترجمے سے اصطلاح کا صحیح اور پورا حق ادا نہیں ہوتا کیوں کہ بقول مولوی عبدالحق مرحوم مستعار الفاظ نہ واپس کئے جاتے ہیں اور نہ وہ زبان جس سے انہیں لیا جاتا ہے، ان سے محروم ہوجاتی ہے - اس لئے "دخیل" کی اصطلاح زیادہ موزوں ہے ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم نے "تت سم" یعنی خالص سنسکرت کلموں کے جوں کے توں لئے جانے کو مستعار اور "تدبھو" یعنی سنسکرت کلموں کو صوتی تغیرات کے بعد لئے

جانے کو دخیل قرار دیا ہے۔ لیکن مولوی عبدالحق مرحوم کا نقطہ نظر زیادہ صحیح ہے اس لئے ہم Loan words کے لئے دخیل کلمات کی اصطلاح ہی استعمال کریں گے۔

دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو کلی طور پر الگ تھلگ رہی ہو۔ دوسری قوموں یا گروہوں سے تھوڑا بہت سابقہ یا ربط ضبط ضرور رہا ہے، خواہ اس کا سبب کچھ بھی ہو۔ اس لئے غیر شعوری طور پر نجی اور سماجی تقاضوں کے تحت کلموں کا لین دین ضرور ہوتا رہا ہے، کم یا زیادہ۔ میل ملاپ، ربط ضبط سے ایسی زبانیں بھی ابھر آتی ہیں، جن کی اساس تو ملکی ہی زبان پر ہوتی ہے لیکن جو اچھی خاصی مخلوط زبان ہوتی ہے۔ انگریزی اور اردو ایسی ہی زبانیں ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ لسانی محبت بلکہ عصبیت، نے زبان کو خالص اور شدھ بنانے کی تحریک چلائی اور دخیل کلموں کو چن چن کر زبان سے خارج کیا۔ لسانی اختلاط اور دخیل الفاظ کا عمل دخل کم تو ہوا لیکن یکسر ختم نہ ہوا۔ ویدک زبان میں دراوڑی اور کول زبانوں کے کلمے بھی در آئے تھے۔ سنسکرتی تحریک نے دیوبانی کو شدھ بنانے کی کوشش کی لیکن بہت سے غیر آریائی کلمے سنسکرت میں رہ گئے ان کو غیر آریائی سمجھا ہی نہ گیا۔ مثلاً مے یور (مور)۔ نیلا۔ پشپہ (پھول)۔ پھل۔ بیج۔ بل۔ روپ۔ راتری (رات) سایم (شام)۔ کال (وقت)۔ کٹ (جھونپڑی)۔ پجن (عبادت) وغیرہ پارسی پاستان کی تحریک نے فارسی کو عربی کے دخیل کلموں سے پاک کرنا چاہا اور قدیم پہلوی اور اوستائی الفاظ کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں کسی قدر کامیابی بھی ہوئی لیکن اب بھی کتنے ہی

عربی کے دخیل الفاظ بلا تکلف استعمال کئے جاتے ہیں۔

دخیل کلموں کے سلسلے میں سب سے پہلے ۱۸۹۷ء میں ای۔ونڈش ((E. Windish)) نے یہ بنیادی اصول بتایا تھا کہ کوئی قوم کسی اجنبی زبان کو سیکھتی ہے تو وہ اجنبی زبان مخلوط زبان نہیں بن جاتی بلکہ ملکی زبان اجنبی زبان یا غیر ملکی زبان کے زیر اثر مخلوط ہو جاتی ہے''۔ جب ہم کوئی غیر ملکی زبان سکیھتے اور بولتے ہیں تو شعوری طور پر ہماری یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس کے قواعد' روزمرہ اور محاوروں کی پوری پابندی ہو اور بھولے سے بھی ہماری زبان کا کوئی لفظ یا کلمہ اس میں نہ آنے پائے۔ اس کے برعکس اپنی زبان بولتے وقت یہ احتیاط نہیں کرتے۔ فریڈرک اعظم جرمن ہوتے ہوئے بھی اپنی فرانسیسی پر ناز کرتا تھا۔ اس کی فرانسیسی تحریروں میں جرمن زبان کا کوئی لفظ ڈھونڈنے سے نہیں ملتا۔ لیکن اس کی جرمن تحریروں میں فرانسیسی الفاظ اور محاوروں کی بہتات ہے۔ انگریزی اور فرانسیسی میں کیلٹک الفاظ بہت کم ہیں۔ حکمراں طبقہ محکوموں کی زبان یا اس کے کلمے استعمال کرکے کیوں فخر کرتا؟ اس کے برعکس کیلٹ قوم حاکموں کی زبان اور اس کے کلموں کو اپنانا باعث افتخار سمجھتی۔ شیخت بگھارنے اور علمیت جتانے کا یہ اچھا نسخہ تھا۔ دور کیوں جائیے مسلمانوں کی آمد کے بعد برصغیر میں فارسی کے استعمال یا بول چال میں فارسی کلمے بولنے کو علمیت اور تہذیب کی نشانی قرار دیا جاتا تھا۔ اور تو اور پاکستان بننے سے کچھ پہلے تک جبکہ اکثریت کی سیاست نے نفرت کی آگ بھڑکا رکھی تھی' سی پی جیسے صوبے میں جہاں مسلمان

آٹے میں نمک کے برابر تھے جبل پور شہر میں ہندو اور مراٹھے پروفیسر، استاد، طالب علم اور دوسرے تعلیم یافتہ افراد ''ش'' - ''ق'' - ''ز'' کی آوازوں پر مشتمل کلموں کے استعمال اور اردو غزل کی ہذیرانی کو تہذیب و تمدن کی علامت سمجھتے تھے - دخیل الفاظ یا کلمے اس قوم یا تہذیبی گروہ کی برتری پر دلالت کرتے ہیں جس سے مستعار لئے جاتے ہیں، یہ برتری کسی بھی نوعیت کی ہوسکتی ہے - برطانوی ہند میں اور آج بھی پاکستان میں تعلیم یافتہ طبقہ خصوصاً سرکاری افسر انگریزی بولتے وقت اس میں اپنی مادری زبان کا کوئی کلمہ بھولے سے بھی استعمال نہیں کرتے لیکن جب اپنی مادری یا قومی زبان بولتے ہیں تو بلا تکلف اس میں انگریزی کلمے، فقرے بلکہ جملے کے جملے استعمال کرجاتے ہیں - انگریزی یا انگریزوں کی کسی نہ کسی نوعیت کی برتری کا خیال ان کے لاشعور میں دبکا ہوتا ہے -

نووارد اجنبیوں کے ساتھ ساتھ معاشرت سے تعلق رکھنے والی نئی چیزیں بھی آجاتی ہیں جو ملکی باشندوں کے لئے دلچسپی کا باعث بلکہ مفید بھی ہوتی ہیں - ان کے ساتھ ان کے نام بھی اپنا لئے جاتے ہیں یا دوسرے ملکوں کی بعض چیزیں ملکی باشندوں کے ذریعے ہی درآمد ہوجاتی ہیں، وہ اور ان کے نام بھی قبول کرلئے جاتے ہیں - انگریزی میں Wine لاطینی سے مستعار ہے tea چینی سے coffee عربی سے - chocolate میکسی کن زبان سے لیا گیا ہے اور punch ہندستانی زبان سے - بعض الفاظ تو دنیا کی کم و بیش تمام زبانوں میں رائج ہوجاتے ہیں، یہ اُن کے مسمیوں کی مقبولیت کا کرشمہ ہے - برصغیر کی جدید

ہند آریائی زبانوں میں مسلمانوں کی آمد کے بعد مذہبی، سیاسی، تہذیبی صنعتی، تجارتی اور علمی ضرورتوں نے بہت سے عربی فارسی الفاظ شامل کردیئے۔ مراٹھے اپنے وزیروں کو پیشوا کہنے لگے، ہندو ریاستوں میں وزیر، "دیوان" کہلایا۔ مہارشٹر میں گاؤں کا مکھیا "مقدم" کہلاتا ہے۔ سی پی میں مزدوروں کا نگران "مقدم" کے نام سے مشہور ہے۔ تحصیل دار، پیش کار، سرشتہ دار، محرر۔ واصل باقی، جمع بندی، مالگزاری، فرد، خزانچی اور ایسے ہی بہت سے الفاظ نئے پھلوں کے ساتھ ان کے نام انگور، انار، سیب، بہی، انجیر، خربوزہ، بادام، کشمش، منقی، ناشپاتی، چلغوزہ، خوبانی۔ نئے پھلوں ساتھ ان کے نام گلاب، گل شبو۔ بنفشہ۔ نرگس وغیرہ۔ پھر نئے نئے کھانے اور ان کے نام پلاؤ، بریانی، شوربا، قورمہ، کباب، یخنی، قیمہ، کوفتہ، حلوہ، ۔ نئی نئی مٹھائیاں بالو شاہی، قلاقند، برفی، گلاب جامن، مٹھائی بنانے والے کے لئے حلوائی نئے نئے کپڑے اور لباس اور ان کے نام مخمل، کمخواب، زری، تن زیب، چارخانہ، کامدانی، زربفت، زرتار وغیرہ کرتہ، اچکن، میرزائی، چوغا، جامہ، عبا، شال، چادر، شلوار، پاجامہ، لحاف، قالین، رضائی بستر، تکیہ، غلاف، موزے، ازربند، کمر بند— اور پھر دیگ، دیگچی، کفگیر، چمچہ، رکابی، پیالہ، دستر خوان، خلال، باورچی، خانساماں شمع، مشعل، قندیل، چق چلمن، پردے، اور لگام، زین لعل، سیئسی سوا۔طوق، تعویز، گلوبند زنجیر پازیب، بازوبند اور ان گنت زیور ان کے نام۔ غرض معاشرت کے ہر شعبے میں نت نئی چیزوں کے ساتھ ان کے بدلیسی نام بھی رائج ہوگئے۔

کچھ دخیل الفاظ کسی قوم یا گروہ کی مخصوص شعبہ

ہائے علم و فن میں برتری پر دلالت کرتے ہیں مثلاً وہ عربی
الفاظ جو ریاضیات اور علم ہئیت سے تعلق رکھتے ہیں اور انگریزی
اور دوسری زبانوں میں دخیل ہے۔ عربوں کی ان علوم میں برتری
پر دال ہیں مثلاً zenith - cipher zero - algebra وغیرہ یا
متعلقہ شعبوں کے الفاظ alcohlo - alkali - tariff وغیرہ بھی
ان کی ان شعبوں میں برتری کا ثبوت ہیں - اٹلی نے دنیائے موسیقی
کو Solo - allegro - piano جیسے اور تجارت کی دنیا کو
balance - bankrupt - Bank جیسے دخیل الفاظ دیئے-یورپ کی
اکثر زبانوں میں فرانسیسی کے اور لاطینی اور یونانی کے تو بہت
زیادہ دخیل الفاظ ہیں اور یہ سب مختلف شعبوں میں ان قوموں
کی برتری کی علامتیں ہیں -

جب ایک قوم یا گروہ دوسری قوم یا گروہ کے زیادہ
سے زیادہ ثقافتی اثرات قبول کرلیتی ہے اور کم و بیش اسی کے
رنگ میں رنگ جاتی ہے تو اپنی زبان کی ہر سطح پر اپنے کلمے،
محاورے اور اصطلاحات لے لیتی ہے کہ زبان مستعار ثقافت کی
آئینہ دار ہوجاتی ہے - قدیم ترکی عربی کے دخیل الفاظ کی کثرت
سے عرب کلچر کی آئینہ دار رہی ہے- اردو، فارسی مآبی کی
وجہ سے ہند ایرانی ثقافت کی غماز ہے-

لسانی لین دین اور دخیل الفاظ کی کثرت کا دارومدار
نسلی ارتباط سے زیادہ ثقافتی وابستگی پر ہوتا ہے- ثقافتی ربط
ضبط اور لین دین جتنا زیادہ ہوتا ہے اسی قدر دخیل الفاظ
کی بہتات ہوتی ہے - ادبی اثرات اور زیادہ اضافہ کرتے ہیں -
اس طرح زبان کے سرمائے اور توانائی میں اضافہ ہوتا رہتا

ہے۔ دخیل الفاظ ایسے بتے کی باتیں بھی بتاسکتے ہیں جن کے بتانے سے تاریخ بھی قاصر رہتی ہے۔ مثلاً توپ بندوق' بارود جیسے الفاظ' مغلوں کے حملوں کے ساتھ ساتھ برصغیر میں آئے۔

دوسری زبانوں سے مستعار لئے جانے والے جو کلمے مستعار لینے والی زبان کے صوتی نظام سے میل کھاتے ہیں' ان کو کم و بیش جوں کا توں لے لیا جاتا ہے لیکن اگر صوتی نظام سے مطابقت نہیں رکھتے تو پھر صوتی عادتوں کے خراد پر تراش کر زبان کے صوتی مزاج کے مطابق ڈھال لیا جاتا ہے۔ مثلاً بنڑن۔ کیٹل۔ ریکروٹ بیرر۔ وغیرہ کو اردو میں لالٹین کیتلی۔ رنگروٹ۔ بیرا بنا لیا گیا ہے۔

کبھی کبھی دوسری زبانوں سے ایسے کلمے بھی مستعار لے لئے جاتے ہیں' جن کی ضرورت نہیں ہوتی اس کی وجہ یہ ہے کہ کلمے مستعار لیتے رہنے سے عادت بگڑ جاتی ہے اور اپنی زبان کے سرمائے کو نظر انداز کرکے بلا وجہ کوئی کلمہ مستعار لے لیا جاتا ہے' فیشن کے طور پر یا علمیت جتانے کے لئے۔ اردو بولنے والے بھی انگریزی کے ایسے کلمے بلاتکلف استعمال کرتے ہیں' جن کے مترادفات اردو میں پہلے ہی سے موجود ہیں مثلاً سولیزیشن۔ کلچر۔ لٹریچر۔ الیکشن۔ اپی نین وغیرہ۔ اس طرح کے کلموں سے زبان میں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں ہو جاتا۔

صرفی تغیرات۔ عام طور پر اسمائے مانعہ ہی کو دخیل الفاظ کے طور پر لیا جاتا ہے۔ ضمائر' اسمائے اشارہ صلات' اعداد وغیرہ کو مستعار نہیں لیا جاتا۔ شاذ و نادر ہی ایسی

کوئی مثال ملے گی کہ ان میں سے کسی کو مستعار لیا گیا ہو۔ مثلاً روس اور ڈنمارک میں لان ٹینس میں انگریزی طریقے پر fifteen love وغیرہ گنا جاتا ہے۔ براہوئی میں تین کے بعد گنتی بلوچی سے مستعار لی گئی ہے۔ کول زبانوں میں بھی تین کے بعد گنتی مستعار لی گئی ہے۔ صلات کبھی مستعار نہیں لئے جاتے لیکن شاذ و نادر مثالیں ان کی بھی مل جاتی ہیں مثلاً اطالوی per، انگریزی میں مستعار لے لیا گیا ہے۔ عام طور پر مستعار لفظ کی کوئی ایک ہیئت کوئی ایک صیغہ لیا جاتا ہے اور پھر مستعار لینے والی زبان کے قاعدوں کے مطابق اس کی تصریف یا گردان ہوتی ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ تصریف یا گردان بھی اصل زبان کے مطابق ہو۔ اردو میں بہت سے الفاظ عربی فارسی سے لئے گئے اور وہ اردو میں آگر اردو قواعد کے ماتحت استعمال ہونے لگے۔ ان کی حالت، جمع، وغیرہ کے اظہار کے لئے اردو قواعد ہی کی پابندی کی گئی لیکن اردو قواعد میں بھی فارسی کا بہت کچھ دخل ہے۔ اسم فاعل اسم مفعول اسم ظرف، اسم آلہ، حرف شرط، واوعاطفہ، حروف تمنا، نفی، تاکید، استثنا وغیرہ ہی فارسی سے نہیں لئے گئے بلکہ اسم فاعل، اسم مفعول، اسم ظرف، اسم آلہ کی جمع وغیرہ بنانے کے قاعدے بھی فارسی اور کبھی کبھی عربی سے لئے گئے۔ یہ بھی ہوا کہ خالص ہندی الفاظ پر بھی ان قاعدوں کا اطلاق کیا گیا۔ اسم فاعل اور اسم ظرف، ہندی الفاظ پر فارسی لاحقوں کے اضافوں سے بنائے گئے مثلاً گاڑی بان۔ پان دان ۔ پیکدان۔ سمجدار وغیرہ سابقے اور لاحقے تو زیادہ تر فارسی سے لئے گئے ہیں۔ کبھی کبھی زبان کی نحو بھی دوسری زبان کی نحو سے

متاثر ہوجاتی ہے سینتی کمار چڑجی کی یہ رائے ہے کہ وسط ہند آریائی کے آغاز ہی سے دراوڑی نحو کے اثرات پڑنے لگے تھے یہاں تک کہ جدید ہند آریائی زبانوں کی نحو، دراوڑی نحو جیسی ہوگئی -

صرفی تغیرات کے اثرات نحو پر - جس طرح کلمے کی صرفی حیثیت، صوتی ارتقا کے زیر اثر آہستہ آہستہ بدل جاتی ہے، اسی طرح صرفی تبدیلیاں جملے کی ساخت میں بتدریج تبدیلی پیدا کردیتی ہیں- یہ درست ہے کہ بعض صرفی ہیئتوں کے ختم ہوجانے مثلاً تثنیہ کے صیغے کے ختم ہونے سے جملے کی ساخت پر کوئی اثر نہیں پڑا اور یہ بھی ممکن رہا ہے کہ ایک صرفی ہیئت یا صرفی عمل کی جگہ دوسرے نے لے لی مثلاً انگریزی کی علامت جمع en,-e,-er کی جگہ "s" نے لے لی تو کوئی نحوی تبدیلی نہیں ہوئی لیکن ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ایک صرفی ہیئت کے ختم ہوجانے سے نحوی تقاضے کچھ بدل گئے اور وہ دلالت جس کا اظہار اس ہیئت سے ہوتا تھا، جملے کی تبدیلی کے ذریعے سے ظاہر کی گئی -

لسانی تغیر عموماً صوتی مظہر ہوتا ہے لیکن اس سے کلمے کی صرفی حیثیت بھی بدل سکتی ہے اور اس کے تفاعلی میں بھی فرق آسکتا ہے اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تغیر صرفی بھی ہوسکتا ہے اور نحوی جدت کا موجب بھی ہوسکتا ہے - صرف ترکیب سے تعلق رکھتی ہے اور نحو تحلیل و تجزیہ سے - زبان صرفی ہیئتوں پر زیادہ زور دیتی ہے تو ترکیبی کہلاتی ہے لیکن تحلیل و تجزیہ کا رجحان

رکھتی ہے تو تحلیلی کہلاتی ہے۔ اس اعتبار سے اینگلوسیکسن بڑی حد تک ترکیبی تھی مگر جدید انگریزی تحلیلی ہے۔ زبان کے چھوٹے چھوٹے تغیرات اصلاً صوتی ہی ہوتے ہیں لیکن ان کی باقاعدہ تعمیم اور کثرت سے صرف و نحو میں بھی تبدیلی آسکتی ہے۔ ہاں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ نحوی تبدیلی بہت سست ہوتی ہے۔

قدیم ہند یورپی میں کلموں کی ہیئتیں بڑی پیچیدہ رہی ہیں، اس کی وارث زبانوں میں لسانی تغیرات کے نتیجے میں پیچیدگیاں کم ہوتی گئیں اور صرفی ہیئتیں بھی کم ہوئی گئیں۔ نگریزی میں گردانیں کم ہوئیں تو صلات (prepositions) اور امدادی کلموں کا استعمال بڑھا اور ان کی وجہ سے جملوں میں کلموں کی ترتیب بعینہ رہی نہ رہی۔ ویدک زبان میں تشکیلیات بڑی پر شکوہ رہی ہیں لیکن کول منڈا اور دراوڑی زبانوں کے زیر اثر تصریفی سادگی پیدا ہوئی تو وسطی ہند آریائی کی نحو دراوڑی نحو سے قریب تر ہوگئی اور جدید ہند آریائی کی نحو تو بعینہ دراوڑی نحو ہوگئی اسی کہ تامل یا تیلگو کے کسی جملے کا لفظی ترجمہ کر دیجئے تو جدید ہند آریائی کا اسی مفہوم کا صحیح جملہ وجود میں آجائے گا۔

معنوی تغیرات۔ اگرچہ لسانی تغیرات میں صوتی تغیرات کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ تاہم معنوی تغیرات بھی اپنی جگہ اہم ہوتے ہیں۔ لغوی یا معنوی تبدیلی کا ذکر کرتے وقت ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کلمے کا حوالہ ایک منظم اکائی کی حیثیت سے دیا جاتا ہے، بات چیت کے

ایک ترکیبی جزو کی حیثیت سے نہیں - بات چیت میں کلمہ مکمل تصرف میں رہتا ہے اور اس کی صوتی و معنوی حیثیت بھی متاثر ہوسکتی ہے، یہاں تک کہ اس کی صوتی معنویتی اکائی بھی بدل سکتی ہے- جملے بجائے خود عبوری حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے لحاظ سے کلموں کی مطابقتیں ہوتی رہتی ہیں اور اس طرح ان مطابقتوں کے ذریعے سے جامد کلموں میں تغیرات اور ان کی بدولت ارتقا ہوتا رہتا ہے- یہ عمل خاصا سست ہوتا ہے لیکن اس کے نتیجے میں نئی ہیئتیں ظہور میں آتی ہیں - اگر ہم لسانی تاریخ کے ایک دور کے لغوی سرمائے کا دوسرے دور کے لغوی سرمائے سے تقابل کریں تو اندازہ ہوگا کہ بہت سے کلموں کی ظاہری ہیئیت اور معنی خیز قدر میں تھوڑی بہت تبدیلی ہوگئی ہے - اسی کو لغوی سرمائے کی تبدیلی کہتے ہیں - لغوی سرمائے کی تبدیلی دراصل زبان بولنے والوں کی مرموزی عادت کی تبدیلی کا نتیجہ ہے -

کسی کلمے کی صوتی تاریخ اور اس کے معنوی ارتقا میں کوئی منطقی مطابقت نہیں ہوتی- ایک کی رفتار تیز ہوسکتی اور دوسرے کی سست - صوتی علامت میں اختصار کا رجحان ہوسکتا ہے تو مدلول میں توسیع کا یا اس کے برعکس - یہ بھی ممکن ہے کہ ایک میں معتدبہ تبدیلی ہو اور دوسری میں بالکل نہ ہو- اگر دونوں میں تبدیلی ہو تو ان میں کسی قسم کا منطقی رشتہ نہیں ہوتا - وسطی انگریزی کا mus بدل کر mouse ہو گیا لیکن مدلول وہی رہا - سنسکرت ''وردل'' نے جدید ہند آریائی میں ''بادل'' کا بہروپ بھرا مگر مدلول میں کوئی فرق نہ آیا- لشٹی- یوکتر ولگا کڈگا نے لاٹھی، جوتا، باگ، اور گڈی کا روپ

دھار لیا لیکن مدلول وہی رہے۔

زبان کی معنویاتی تبدیلی کے سلسلے میں کلموں کے متروک ہوتے رہنے اور نئے کلموں کے جنم لیتے رہنے کے عمل کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہر زبان کے ارتقائی سفر میں کچھ کلموں کا چلن کم ہوتے ہوتے ختم ہوجاتا ہے اور وہ ذہنوں سے بھی محو ہوجاتے ہیں۔ معاشری اور اقتصادی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ کچھ چیزیں، ادارے، تصورات اور خیالات مد فاضل ہو کر اپنی افادیت کھو دیتے ہیں تو ان کی صوتی علامتیں بھی غیر ضروری ہو جاتی ہیں اور آہستہ آہستہ ان کا رواج ختم ہو جاتا ہے۔ اگر ایسی کوئی صوتی علامت متروک نہیں ہوجاتی تو اس کے مفہوم میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور آجاتی ہے۔ سائنسی تحقیقات وانکشافات اور روز مرہ زندگی پر ان کے اطلاق، فکر و خیال کی انسان اور کائنات کے بدلتے ہوئے کوائف سے مطابقت، ذرائع نقل و حمل کی سہولت، صنعت و حرفت، تجارت و معیشت کے وسائل کی اثر آفرینی نے تحریری لفظوں کو عمومی رواج دینے میں خاصا کردار ادا کیا ہے۔ مختلف علوم و فنون صنعت و حرفت، سائنسی کرشموں نے نت نئے کلموں کو جنم دیا، جن کو تکنیکی کلمے ہی کہہ سکتے ہیں اور جو اولاً مخصوص طبقوں میں رائج رہے لیکن ان میں سے اکثر عالم گیر طور پر زبان زد ہوگئے۔ ٹی-بی۔ ٹائیفائیڈ، نمونیہ ملیریا آکسیجن، ہائیڈروجن، ریڈیو، ٹیلی فون، ٹیلی وژن وٹامن اور ایسے ہی بہت سے الفاظ اکثر زبانوں میں عام طور پر رائج ہیں۔

دوسری زبانوں سے لئے ہوئے مستعار کلموں کی وجہ سے

ایک ہی مفہوم یا مدلول پر دلالت کرنے والے کئی کئی کلمے بھی رائج ہو جاتے ہیں، انگریزی اور اردو میں مترادفات کی تعداد کافی ہے۔ ان دونوں زبانوں میں مختلف ادوار میں غیر زبانوں کے کلمے مستعار لئے جاتے رہے ہیں۔ stool اور head-chair اور chief اور sympathy اور compassion - sharp اور acute اور ایسے ہی کئی مترادفات انگریزی میں رائج رہے ہیں اور بعد میں ان میں لطیف فرق کیا جانے لگا۔ اردو میں رنج، غم، افسوس اور تاسف مستعار الفاظ ہیں اور مترادفات لیکن یہ زیادہ عرصے مترادفات نہیں رہے۔ ان میں لطیف و نازک فرق کا پہلو نکالا جانے لگا۔ اسی طرح چاہت، انس، الفت، محبت، عشق میں بھی معنے کا لطیف فرق پیدا کر لیا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بہت سے لوگ ان کو مترادفات کی حیثیت دیتے رہے ہیں جہاں تک کلموں کی تخلیق یا تشکیل کے طریقوں کا تعلق ہے، مختلف زبانوں کے بولنے والوں نے بڑی حاضر دماغی اور سمجھ بوجھ کا ثبوت دیا ہے۔ نطق انسانی کے آغاز میں جب کوئی صوتی نظام ارتقا نہ پاسکا تھا اور صرفی سانچوں کا وجود نہ تھا، کلموں کی براہ راست تخلیق زیادہ ہوتی رہی ہوگی۔ فطری آوازوں کی نقالی اور جذباتی رویوں کے بے ساختہ اظہار نے ہر قسم کے حکائی کلمے (اسم اصوات) یا کلمات تکرار یا فجائیہ کلمے یا جملے پیدا کئے ہوں گے۔ ان قدیم ترین کلموں یا جملوں کی نشان دہی ممکن نہیں۔ جہاں تک زبان کی تاریخ کا سراغ لگایا جا سکا ہے، اس کے پیش نظر کلموں کی براہ راست تخلیق کے متعلق کچھ کہنا بہت دشوار ہے۔ عام طور پر قدیم ترین کلموں کی تخلیق کے جو شواہد پیش کئے جاتے ہیں وہ عموماً کسی نہ کسی زبان کے صوتی نظام

کی کسی خصوصیت کی بنیاد پر پیش کئے جاتے ہیں - کہا جاتا ہے کہ سترھویں صدی عیسوی میں ڈچ کیمسٹ فان ہمبولٹ نے لفظ " گیس " کی اختراع کی لیکن سچ پوچھئے تو یہ لفظ ایسی آوازوں پر مشتمل ہے جن سے ایک ڈچ اچھی طرح مانوس تھا اور پھر یونانی لفظ کی مثال بھی اس کے سامنے تھی - اگر اس لفظ میں th کی آواز ہوتی تو یہ لفظ ڈچ قوم میں رائج نہ ہو سکتا تھا - مختلف زبانوں میں جو اسمائے اصوات رائج ہیں وہ بھی صوتی ارتقا کی تھوڑی بہت منزلیں ضرور طے کر چکے ہیں -

دخیل اور مستعار کلموں میں سے بہت سے معنوی تصرف کے بعد اپنائے جاتے ہیں کبھی کبھی تو مستعار لینے والی زبان ان کو بالکل نئے مفہوم دے دیتی ہے ۔ اردو میں عربی فارسی کے سینکڑوں ایسے دخیل اور مستعار کلمے ہیں جن کے اصل معانی کو اردو میں نظر انداز کردیا گیا ہے - مثلاً اردو میں " مشکور " کے معنی اردو کا تصرف ہے - " اسباب " بمعنی سامان اردو کی اختراع ہے - " وجہ " عربی میں " منہ " کو کہتے ہیں لیکن اردو میں اس سے مراد " سبب " ہے - " نقد " عربی میں پرکھنے کے معنی دیتا ہے مگر اردو میں " ادھار " کے برعکس مفہوم میں مستعمل ہے - اردو میں " جلوس " کا جو مفہوم ہے عربی والے اس سے نا آشنا ہیں - حضرت' حضور' صاحب اصل معانی اردو میں کون مراد لیتا ہے ؟- مواد' مادہ کی جمع ہے لیکن اردو میں واحد ہے اور دو مخصوص معنوں میں مستعمل ہے' پھوڑے کا مواد اور مضمون کا مواد - " فلک " عربی میں آسمان ہے لکین اردو والے فلاکت' فلاکت زدہ' مفلوک الحال' کن معنوں میں استعمال کرتے ہیں - دوسری

زبانوں کی اصطلاحوں اور محاوروں کو ترجمے کرکے بھی اپنا لیا جاتا ہے - انگریزی اور اردو سے بہت سی ایسی مثالیں دی جا سکتی ہیں -

کلمے عامیانہ بول چال، تکنیکی اور گروہی زبانوں سے بھی لے لئے جاتے ہیں اور انھیں زبانوں میں بلا تکلف استعمال کیا جاتا ہے مثلاً cone plexione temperament-humour قدیم علم الاعضا کے سرمائے سے انگریزی زبان میں لئے گئے ہیں - بعض کلمے اور محاورے جو کسی طبقے یا طبقوں تک محدود ہوتے ہیں، بتدریج عامۃالناس کی زبان پر بھی آجاتے ہیں - "ٹانکے ڈھیلے کرنا" - "بخیئے ادھیڑنا" درزیوں کے طبقے تک محدود تھے لیکن اب عام اردو بولنے والے خواہ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں، بلا تکلف انھیں استعمال کرتے ہیں - "بکٹ"- "دھونس" - "کٹر" چت کرنا - پٹ کرنا بھی عوام کی زبان پر آچکے ہیں - اس طرح بہت سے کلمے "سلینگ" سے "روز مرہ" کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں -

خیال یا تجربہ وقوع پزیر ہوتا ہے، اور ختم ہوجاتا ہے، خواہ اسے کسی نطقی علامت کے ذریعے ظاہر کیا جائے یا نہ کیا جائے، اور اگر ظاہر کیا جائے تو کسی بھی طرح ظاہر کیا جائے صوتی علامتوں سے جو معانی منسوب ہوجاتے ہیں، وہ تدریجی اور متفق علیہ ہوتے ہیں اور ان میں سائنسی قطعیت نہیں ہوتی بہت دنوں تک ایک سے زیادہ معنوی پہلو، ان علامتوں سے ظاہر ہوتے ہیں اور پھر بتدریج ایک کو قبول عام کی سند مل جاتی ہے - اس ایک کا انتخاب دراصل سماجی

ذہنی انسانی حقیقت کا مظہر ہے اس لئے سماجی نفسیاتی تبدیلی کی وجہ سے کلمے کے معنی میں تبدیلی بھی ہوسکتی ہے۔ کبھی کبھی کوئی صوتی مماثلت تبدیلی کا سبب بن جاتی ہے مثلاً '' by law '' اصلاً اسم تھا اور اس سے مراد '' شہر '' لیا جاتا تھا لیکن اس کے پہلے سلیبل کی مماثلت صلہ '' by '' سے ہے اسے لئے صوتی مماثلت کی وجہ سے '' by '' کے معنی بدل کر by name 'by path جیسے کلمے بنالئے گئے۔ ثقافتی تبدیلیاں بھی کلموں کے معانی بدل دیتی ہیں۔ شروع شروع میں '' pen '' صرف ایک '' پر '' تھا لیکن جب لوہے کے قلم بنے تو اگرچہ مدلول بدل گیا لکین اس کے لئے کلمہ '' pen '' ہی استعمال ہوتا رہا۔ اسی طرح morals virtue 'religion 'mind اب بدلے ہوئے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ مغل حکومت کا زوال ہوا تو مغل خواتین میں سے کچھ کو گھروں میں کام کاج بھی کرنا پڑا اور کلمہ '' مغلانی '' نوکرانی کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا۔ قدیم زمانے میں غلاموں کو آزاد کرنے کے لئے '' تحریر '' کیا جاتا تھا، اور تحریر سے مراد لیا جاتا تھا '' آزاد کرنا '' لیکن اب اسے محض لکھنے کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

اکثر زبانوں میں بعض موقعوں پر کلموں کو مجازی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور اس طرح معنی بدل جاتے ہیں مثلاً '' chief '' کے لغوی معنی ہیں '' سر '' لیکن ایک خاص شخص کے لئے استعمال کیا جاتا ہے' یا ایک اہم اور مخصوص چیز کے لئے۔ اردو میں '' مجاز مرسل '' اور '' استعاروں '' سے اس طرح کی تبدیلیوں کی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ مادی

کاچہ کی تدبیلی سے ''کلموں'' کے معنوں میں توسیع ہوجاتی ہے مثلاً '' Jet '' کے معنی میں مائع یا گیس کی نکالی ہوئی تیز دھار لیکن اب جیٹ طیارے کو کون نہیں جانتا — ''nuclear'' سے مراد ہے ''مرکزی'' لیکن اب کلمہ نیو کلیر ہاور کس معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ ''circumstance'' کے لغوی معنی تھے ''جو کچھ آس پاس ہو'' لیکن اب معنی میں کتنی وسعت آچکی ہے۔ وسطی انگریزی میں '' bird '' سے مراد چھوٹا پرندہ لیا جاتا تھا لیکن اب چھوٹے کی تخصیص نہیں ہے۔ معنویاتی تخصیص سے معانی سمٹ بھی جاتے ہیں مثلاً بائیبل کے ترجمے کے وقت '' meat '' کا مفہوم تھا عام کھانا' لیکن دیکھئے اب س کا مفہوم کتنا سمٹ چکا ہے۔ '' fowl '' عام پرندوں سے مرغیوں کی قسم کے پرندوں تک محدود ہوگیا فارسی '' مرغ '' اردو میں پرندہ نہیں رہا '' مرغا '' اور '' مرغی '' بن کر محدود معنے دینے لگا۔ اسمائے خاص میں بھی معنویاتی توسیع ہو جاتی ہے Rolls اور Royce دو موٹر بنانے والے تھے لیکن اب Rolls – Royce مخصوص '' کار '' ہے - آئرش کیپٹن بائیکاٹ کے نام نے معنوی توسیع سے بائیکاٹ (اسم اور فعل) کی حیثیت حاصل کرلی اور مخصوص معانی دینے لگا۔ گروہی یا قومی مزاج کے بدلنے اور تہذیبی واخلاقی مدو جزر کے ساتھ ساتھ کلموں کی معنوی ترقی بھی ہوتی ہے اور معنوی انحطاط بھی۔ '' حج '' محض '' جانا '' کا مفہوم ادا کرتا تھا اب اس کے معنی کتنے مقدس ہیں کلمہ '' شریعت '' گھاٹی یا ندی کا کنارہ کے معنی بدل کر کہاں پہنچ گیا ہے۔ '' شہید '' شہادت دینے والا تھا لیکن اب اس کا مفہوم کتنا مبارک ہے۔ ''شیخ'' عربی میں بزرگ کو کہتے تھے لیکن شیخی اور

شبخت کے معانی پر غور کیجئیے " شاطر "۔" عیاز "۔" دلالہ "۔
" نائکہ "۔ " لن ترانی " ۔ "رام کہانی " " قل آعوذی "۔
" گروگھنٹال " کے اصل معانی کیا تھے اور اب کیا ہوچکے ہیں ۔

لسانی تغیرات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ تغیرات کی وجہ سے ایک ہی زبان میں متحدالصوت ایسے کلمے بھی پیدا ہوجاتے ہیں، جن کے معانی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسے کلموں سے خلط معانی کا امکان بھی پیدا ہوسکتا ہے لیکن عموماً جملوں میں ان کے سیاق و سباق سے یہ امکان ختم بھی ہوسکتا ہے۔

ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ شروع شروع میں کلموں کے جو متعدد معنوی " شیڈ " ہوتے ہیں، بتدریج ان میں سے ایک مختص ہوجاتا ہے لیکن کبھی کبھی ایک سے زیادہ مفاہیم بھی وابستہ ہوکر رہ جاتے ہیں۔ قدیم زبانوں ہی میں نہیں بلکہ خاصی ترقی یافتہ اور متمدن زبانوں میں بھی ایسی مثالیں خاصی مل جاتی ہیں مثلاً انگریزی کلمہ fast متعدد معانی دیتا ہے۔ ایک مفہوم " تیز رفتار " تو عام ہے لیکن جب fast-colour کہا جاتا ہے تو " پکا رنگ " مراد لیا جاتا ہے fast friend میں اس کلمے کے معنی ہوتے ہیں " گہرا " fast life کہہ کر فضول خرچ کا مفہوم مراد لیتے ہیں، اردو میں " پر " سے اوپر مگر اور " اڑنے والا پر " تینوں مراد لئے جاسکتے ہیں۔

ہم آئے دن لسانی زندگی میں صوتی علامتوں اور ان کے مفاہیم کے باہمی روابط اور ان کی کار فرمائی کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں اس لئے ہم صوتی تغیرات کو دوسرے تغیرات سے الگ

تھلگ نہیں کرسکتے صوتی تغیرات کو ان کلموں سے جن میں ان کا عمل ہوتا ہے، علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور کلموں کو جملوں سے الگ تھلگ نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ ہی صوتی اور غیر صوتی تغیرات کے درمیان حد فاصل کم کی جا سکتی ہے اکثر موقعوں پر دونوں کا نفسیاتی مقصد ایک ہی ہوتا ہے - دونوں تقلید یا نقالی کے ذریعے ہی فروغ پاتے ہیں - اس حقیقیت کا اطلاق ہر لسانی تبدیلی پر ہوتا ہے خواہ وہ صوتی ہو، صرفی ہو، نحوی ہو، نئے کلموں کی تشکیل ہو یا پرانے کلموں کا ترک -

مندرجہ بالا مباحث میں لسانی تغیرات کی جن نوعیتوں اور ان کے جن اسباب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے وہ دنیا کی تمام زبانوں پر محیط اور جامع و مانع نہیں ہیں اس لئے کہ تغیرات کا انحصار خارجی عوامل ہی پر نہیں انسانی مزاج اور نفسیات پر بھی ہے اور ایک ہی زبان میں تغیرات کی اتنی ان گنت نوعیتیں ہوتی ہیں کہ ان سب کی جامع گروہ بندی اور سائنسی توجیہ ممکن نہیں - تاہم یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ لسانی تغیرات ہی کی وجہ سے زبان سماج کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو پورا کرتی ہے اور زندہ اور فطری زبان کہلاتی ہے اور اگر زبان کو ان تغیرات سے محفوظ رکھنے کی شعوری کوشش کی جائے تو وہ آہستہ آہستہ زندگی سے کٹ جاتی ہے – زبان کے نمو پانے اور پھلنے پھولنے میں لسانی تغیرات کا اہم کردار ہوتا ہے –

ترقی یا لسانی انحطاط

زبان کے سلسلے میں " ارتقا "۔" بالیدگی "۔"نمو پذیری" اور اسی طرح کی دوسری اصطلاحات استعمال کی جاتی رہی ہیں لیکن ان اصطلاحات میں قطعیت نہیں رہی ہے۔ ان کے سیاق و سباق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان سے مراد عموماً ترقی کا رجحان نہیں ہے۔ یہ صراحت نہیں ہوتی کہ ان اصطلاحات سے بہتر سے بہتر، زیادہ ترقی یافتہ اور اکمل بننے کا رجحان مراد لیا جارہا ہے۔ بلکہ ان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ زبان میں مستقل طور پر تغیر و تبدیل ہوتا رہتا ہے لیکن تغیر و تبدل کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ کچھ ماہرین لسانیات نے البتہ تغیرات کی قدر و قیمت پر محاکمہ بھی کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تغیرات کا رخ بجائے ترقی کے انحطاط کی طرف ہوتا ہے۔ یسپرسن کی یہ رائے صحیح ہے کہ اکثر انسان ماضی پرست ہوتے ہیں اور وہ ماضی بعید کو سنہرے دور سے تعبیر کرکے زمانہ حال کو فروتر سمجھتے رہے ہیں۔ چناں چہ زبان کے سلسلے میں بھی اسی قسم کی رائے قائم کی جاتی رہی ہے۔ لسانیات کی تاریخ میں پہلا قابل ذکر نام ہرڈر کا لیا جاتا ہے۔ اس نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اس کے اپنے دور کی جرمن زبان لوتھر کے دور کی زبان کے مقابلے میں فروتر ہے اور

ڈوبین شہنشاہوں کے دور کی زبان سے تو اور زیادہ حقیر ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں فریڈرک فان شلیگل نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ گرامر کے آرٹ اور زبان کی اکملیت میں تضاد ہوتا ہے۔ وہ اشتقاقی زبانوں کو نامیاتی قرار دے کر انہیں ارتقا کی بلند ترین سطح کا نمائندہ سمجھتا ہے لیکن ان کے متعلق یہ رائے بھی ظاہر کرتا ہے کہ ان کی ساخت کا حسن اور ان کی فن کاری ختم ہوچکی ہے۔ جرمن، رومانی اور ہندوستانی زبانیں اسی لئے اپنی پچھلی ہئیتوں کے مقابلے پر انحطاط پذیر نظر آتی ہیں۔ فرانز بوپ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "Conjugation System der Sanskrit prache" میں یہ اشارہ کیا ہے کہ زبانیں قدیم ترین معلومہ زمانے میں کامل ترین صورت اختیار کر چکی تھیں اور اسی وقت سے ان کے انحطاط کا دور شروع ہوچکا تھا۔ گرم پر تنقید کرتے ہوئے اس نے یہی بات اس طرح دہرائی ہے کہ ہند یورپی زبانیں ہمیں جس حالت میں ملی ہیں، اس میں ممکن ہے کہ انہوں نے نحوی اعتبار سے ترقی کرلی ہو لیکن جہاں تک گرامر کا تعلق ہے، اس کامل ترین ساخت کی خصوصیات کم و بیش مٹ گئیں، جس میں علیحدہ علیحدہ عناصر، باہم قطعی اور حتمی رشتوں میں منسلک تھے اور جس کے ہر مشتق کے آئینے میں اس کے ماخذ سے تعلق کی تصویر صاف دکھائی دیتی تھی۔ ۱۸۳۶ء ولہم فان ہمبولٹ

"زبان کا آغاز اور ارتقا" (یسپرسن صہ۵۵) اس باب کی تالیف میں یسپرسن سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے

کے نزدیک زبان، اپنے بولنے والوں کی بدلتی ہوئی ذہنی قوت کے زیر اثر مسلسل ارتقا پذیر رہتی ہے۔ اس کے ارتقا کے دو مخصوص دور ہوتے ہیں۔ ایک وہ دور جس میں نطق کی تخلیقی جبلت نمو پذیر اور فعال ہوتی ہے اور دوسرا وہ جس میں ظاہری جمود شروع ہوتا ہے اور پھر تخلیقی جبلت کا خاصا انحطاط ہوتا ہے۔ انحطاط کا دور زبان میں زندگی کے نئے اصولوں اور کامیاب تغیرات کا آغاز بھی کر سکتا ہے۔ ہیئت کی تخلیق کے دور میں زبان کے بولنے والوں کی توجہ زبان پر زیادہ ہوتی ہے اور اس کے مقصد پر کم۔ وہ اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار کی جدوجہد کرتے ہیں اور کامیابی کی حوصلہ افزائی زبان کی تخلیقی قوت کو پیدا بھی کرتی ہے اور قائم بھی رکھتی ہے۔ دوسرے دور میں اشتقاقی ہیئتوں کی ٹوٹ پھوٹ ہونے لگتی ہے۔ جب انسانی ذہن زیادہ فعال ہوتا ہے تو زبان میں بڑی تیزی سے تغیرات ہوتے ہیں۔ احتساسی کیفیت سے ذہنی تفاعل کی طرف ارتقا، زبان میں تغیر و تبدل کا موجب ہوتا ہے۔ ایسی آوازیں جو مفہوم کو سمجھنے کے لئے زیادہ ضروری نہیں ہوتیں مختصر ہو جاتی ہیں یا حذف۔ پہلے دور میں زبان کے عناصر کو سن کر انسانی ذہن میں ان کے ماخذ بھی ابھر آتے ہیں اور ذہنی تفاعل کے وسیلے یعنی زبان کے ارتقا میں ایک طرح کا جمالیاتی حظ ملتا ہے لیکن دوسرے دور میں زبان زندگی کی عملی ضرورتوں ہی کو پورا کرتی ہے۔ اسی لئے یہ ہوسکتا ہے کہ انگریزی زبان اپنی ہئیتوں کو ختم کرکے (ساخت کے لحاظ سے) چینی زبان کی مماثل ہوجائے — (بحوالہ یسپرسن) جیکب گرم نے زبان کے تین ادوار بتائے ہیں اور ان پر یوں محاکمہ

کیا ہے کہ " زبان اپنی بالکل ابتدائی صورت میں غنائیت سے بھر پور تھی لیکن غیر منظم اور منتشر سی - درمیانی دور میں اس میں شاعرانہ قوت کی شدت پیدا ہوگئی اور تیسرے دور میں اس کے نظم و ضبط اور مجموعی توازن کی وجہ سے اس کا حسن ختم ہو گیا - اس میں شک نہیں کہ وہ زیادہ موثر ہو گئی لیکن اس کے وسائل حقیر تر ہو گئے -" (بحوالہ یسپرسن) **گرم** نے اکثر موقعوں پر زبان کے انحطاط کا ذکر چھیڑا ہے - مثلاً وہ کہتا ہے کہ ہند یورپی خاندان کی تمام پرانی زبانوں میں ہیئتوں کی خوش گوار، قابل داد اور بے بہا کامایت نظر آتی ہے - انہی زبانوں کی بعد کی ارتقائی منزل پر اشتقاق کی اندرونی قوت ماند پڑ گئی، ہاں یہ ضرور ہوا کہ کہیں کہیں ان کی جگہ امدادی کلموں نے لے لی - مجموعی طور پر زبان کی تاریخ کاملیت کے دور سے کم تر کامل سطح کی طرف انحطاط کا نقشہ پیش کرتی ہے - انیسویں صدی کے بیشتر ماہرین لسانیات نے کم و بیش یہی نقطہ نظر پیش کیا ہے ایک آدھ موقع پر **گرم** نے خود اپنے ان خیالات کی مبہم سی تردید کی ہے اور یہ کہا ہے کہ صرفی اور اشتقاقی ہیئتوں کے خاتمے کی تلافی بعض ایسی چیزوں سے ہو جاتی ہے جو اتنی ہی بلکہ کبھی کبھی ان سے بھی زیادہ کارآمد ہوتی ہیں - انسانی زبان بظاہر اور کچھ مخصوص اعتبار سے زوال پذیر نظر آتی ہے لیکن مجموعی طور پر وہ ترقی پذیر ہے اور اس کی اندرونی قوت مسلسل بڑھ رہی ہے وہ انگریزی زبان کی مثال پیش کرتا ہے جس نے تمام پرانے صوتی قوانین کو تہ و بالا کر کے اور بہت سی صرفی ہیئتوں کو خیر باد کہہ کر ایسی توانائی پیدا کرلی ہے جس کی مثال کسی

دوسری زبان میں نہیں ملتی اور جس کی وجہ سے وہ عالمی اور بین الاقوامی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ **گرم** کا یہ خراج عقیدت **شلیخر** کی رائے کے بالکل برعکس ہے ــ **شلیخر** انگریزی کے متعلق یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ تاریخی اور ادبی لحاظ سے ایک بڑی اہم قوم کی زبان ” کتنی “ تیزی سے زوال پذیر ہوسکتی ہے “ــ **شلیخر** کے نزدیک زبان کی تاریخ انحطاط ہی سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔ **میکس ملر** کا یہ خیال ہے کہ ” تمام آریائی زبانوں کی تاریخ تدریجی انحطاط کے سوا کچھ بھی نہیں۔“ دراصل تقابلی لسانیات کے ماہرین نے قدیم زبانوں کی تعریف و توصیف کے سلسلے میں اس لئے مبالغہ کیا ہے کہ انہی کی بدولت انہیں وہ لسانی مواد میسر آیا جس پر انہوں نے تقابلی گرامر اور تقابلی و تاریخی لسانیات کی عظیم الشان عمارت تعمیر کی ہے۔ جو لسانی مواد جتنا زیادہ قدیم تھا وہ تقابلی لسانیات کے ماہرین کے لئے اتنا ہی زیادہ دل چسپ اور مفید تھا۔ بعد کے ادوار کی ہئیتوں کے تغیر و تبدل کو عموماً صوتی نحت و تخریب قرار دیا جانے لگا اور بدلی ہوئی ہئیتوں کو ماضی کی پرشکوہ ہئیتوں کے شکستہ اور منہدم آثار سمجھنے کا رجحان پیدا ہوگیا۔

کچھ ایسے بھی ماہرین لسانیات نظر آتے ہیں جنھوں نے زبان کی قدر و قیمت کے محاکمے میں افراط و تفریط سے کام نہیں لیا ہے۔ انہوں نے جدید زبانوں کو بھی درخور اعتنا سمجھا اور بعض موقعوں پر انہیں قدیم زبانوں یا ان کی قدیم‘ حیثیتوں سے بہتر بھی قرار دیا ہے ــ **ریسک** نے اپنے زمانے

کی جدید زبانوں کی سادگی پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ سادگی، کے فوائد پرشکوہ لسانی ساخت کے مقابلے پر زیادہ ہوسکتے ہیں۔ میڈوگ کلاسیکی زبانوں کی زیادہ تعریف و توصیف پسند نہیں کرتا لیکن جدید زبانوں کی حمایت میں صرف اتنا ہی کہتا ہے کہ جدید تحلیلی زبانیں اتنی ہی اچھی ہیں جتنی پرانی ترکیبی یا تالیفی زبانیں — وھٹنے نے زبان کے ارتقا سے متعلق ملی جلی باتیں، کہی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زبان کی ترقی یا انحطاط سے متعلق کوئی حتمی رائے دینے سے جھجکتا ہے۔ قدیم ہیئتوں کے خاتمے پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ ان میں سے بعض تو متروک ہوسکتی تھیں لیکن بعض کار آمد تھیں اور ان کے خاتمے سے زبان کی توانائی اور اظہار کی قوت پر اچھا اثر نہیں پڑا۔'' ''صوتی نحت و تخریب سے گرامر کی وہ ہیئتیں وجد میں آتی ہیں جو متصرفہ زبانوں کا بیش بہا سرمایہ کہلا سکتی ہیں''۔ ایسے لسانی امتیازات جو عملی اعتبار سے غیر ضروری ہیں، وہ ان کو نظر انداز یا ختم کرنے کے رجحان کو صحیح قرار دیتا ہے اس کے نزدیک زبان میں غیر حقیقی جنس ضروری نہیں اس لئے اسے ختم کردینا چاہیئے لیکن شرطیہ یا احتمالیہ طور کے ختم ہونے سے زبان کمزور پڑجاتی ہے۔ قواعدی لاحقوں کو ختم کرنا لسانیاتی ضیاع ہے اور انگریزی میں قواعدی لاحقوں کو زیادہ سے زیادہ ختم کرنے کے رجحان نے لسانی انحطاط کی صورت بھی اختیار کرلی ہے''۔

زبان کے ارتقا سے متعلق محاکمہ کرتے وقت یہ ضروری

تھا، کہ اس کے اجزا کا اٹکل پچو انتخاب کر کے پڑتال اور تقابل کرنے کے بجائے اس کی مجموعی ساخت اور امتیازی اور بنیادی خصوصیات کی نمائندگی کرنے والے اجزا کا انتخاب کیا جاتا اور ان کی جانچ پڑتال اور تقابل کے ذریعے عمومی کلیے اور رجحانات اخذ کئے جاتے اور ان کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا جاتا کہ مجموعی طور پر زبان کے بولنے والوں کو لسانی بیوہار کے اعتبار سے کیا کچھ فائدے یا نقصانات پہنچے۔ انھی کے لحاظ سے تغیر و تبدل کو ترقی یا انحطاط سے تعبیر کیا جاتا۔ زبان پر محاکمہ دینے والے ماہرین نے ایسا نہیں کیا۔ انھوں نے لسانیاتی قدر و قیمت کو ناپنے کا کوئی معروضی پیمانہ بھی نہیں بتایا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ زبان ایک سماجی ادارہ ہے جو بولنے والوں کے نطقی عمل کی بدولت وجود میں آتی اور فروغ پاتی ہے۔ اس کا ایک قطعی مقصد ہوتا ہے، خیالات اور احساسات کا ابلاغ۔ اگر اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے تو لسانیاتی قدروقیمت کو ناپنے کے پیمانے تلاش کرلینا زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ اس نقطۂ نظر سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلند ترین سطح پر اس زبان کو رکھا جاسکتا ہے جو زیادہ سے زیادہ معانی کو سادہ ترین ذرائع سے ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ گویا بولنے والوں یا انسان کو مرکزی اہمیت دے کر زبان کی لسانیاتی قدر و قیمت کا محاکمہ کرنا چاہئے۔ دوسرے لفظوں میں زبان کی اظہاریت اور اس کے بولنے میں زیادہ سے زیادہ سہولت یعنی کم سے کم عضویاتی اور ذہنی محنت کو اہمیت دینا ضروری ہے۔ لیکن اظہاریت اور عضویاتی اور ذہنی محنت کے تقابل کے لئے کیا

پیمانے ہوسکتے ہیں ؟ ان دونوں میں سے کس کو زیادہ اہمیت دی جا سکتی ہے اور کس قدر زیادہ ؟ اور پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مادری یا پہلی زبان کے بولنے والوں کو بول چال میں کسی قسم کی عضویاتی اور ذہنی محنت نہیں کرنی پڑتی کیوں کہ وہ بچپن سے اسے بولتے آئے ہیں ۔ لیکن یہ خیال درست نہیں ۔ زبان خواہ مادری ہی کیوں نہ ہو، بولنے میں تھوڑی بہت عضویاتی اور ذہنی محنت ضرور کرنی پڑتی ہے، یہ اور بات ہے کہ ایک طرح کی میکانکی طریقے اور عادت ہوجانے کی وجہ سے اس محنت کا شعور نہیں ہوتا ۔ بچے جب اپنی مادری زبان سیکھتے ہیں تو ان سے لغزشیں بھی ہوتی ہیں ۔ اور وہ اردگرد کے ماحول سے بتدریج صحیح زبان سیکھ پاتے ہیں ۔ زبان کی ساخت جتنی زیادہ پیچیدہ ہوگی اس کے سیکھنے میں اتنی ہی زیادہ عضویاتی اور ذہنی محنت سے کام لینا پڑے گا خواہ وہ مادری زبان ہی کیوں نہ ہو ۔ عام طور پر ذہنی پریشانی اور نفسیاتی الجھنوں کے دوران اپنی ہی زبان کا صحیح استعمال مشکل ہو جاتا ہے یا اگر کسی ایسے موضوع پر گفتگو یا تقریر کرنے کے لئے کہا جائے جو آپ کو پسند نہ ہو تو آپ اس موضوع پر گفتگو کا حق ادا نہ کرسکیں گے اور یہ محسوس کریں گے کہ آپ کی بات یا تقریر بے ربط ہے کہیں کہیں جملوں کی ساخت بھی بے تکی ہے اور الفاظ کا استعمال بھی بے محل ۔

اصوات کی تاریخ اکثر حالت میں خارجی عوامل پر منحصر ہوتی ہے اور خارجی عوامل مختلف بلکہ متضاد رجحانات پر مشتمل ہوسکتے ہیں اس لئے صوتی تغیرات سے متعلق آفاقی

اصول وضع کرنا ممکن نہیں۔ تغیرات سے پہلے اور بعد کی حیثیتوں کی تقابلی قدر و قیمت سے متعلق حتمی محاکمہ بھی نہیں ہوسکتا۔ ہاں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ جن صوتی تغیرات کی وجہ سے ابلاغ میں ابہام اور دشواری پیدا ہوجائے وہ زبان کے لئے نقصان رساں ہوتے ہیں لیکن ایسے تغیرات کو عموماً قبول عام کی سند نہیں ملتی اور آہستہ آہستہ ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نئی حیثیتیں خود ہی مٹ جاتی ہیں —

ایک عالم Baudouin de covrtenay نے زبانوں کے آفاقی ترقی کے رجحان کی پر زور وکالت کی ہے۔ اور اس ضمن میں صوتی نظام ہی کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس کی یہ رائے ہے کہ جن آوازوں کے مخارج منہ کے بالکل اندرونی حصے میں ہیں، انہیں ترک کرنے اور دانت اور ہونٹوں کی مدد سے ادا ہونے والی آوازوں کو زیادہ استعمال کرنے کا رجحان عام ہے حنکی، غشائی اور حلقی آوازوں پر لبی اور اسنانی آوازوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لبی اور اسنانی آوازوں کی ادائیگی زیادہ سہل ہوتی ہے لیکن Baudouine کی رائے کا اطلاق دنیا کی تمام زبانوں پر بمشکل کیا جاسکتا ہے —

ہاں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ایک صوتی رجحان کم و بیش آفاقی ہے، اور وہ ہے کلموں کو مختصر کرنے کا رجحان۔ زبان میں جو، صوتی تغیرات ہوتے رہتے ہیں، ان کے نتیجے میں کلمے نسبتاً مختصر ہوجاتے ہیں۔ کمزور سلیبل کے مصوتے نہایت خفیف طور پر ادا ہوتے ہیں اور آخر حذف ہوجاتے ہیں۔ اکثر زبانوں میں آخری مصوتے حذف ہوگئے ہیں۔ جدید ہند آریائی

زبانوں میں وسطی ہند آریائی کے آخری مصوتے ختم ہوچکے ہیں - ڈینش اور جرمن بول چال میں بھی آخری مصوتوں کو ختم کر دیا گیا ہے - روسی زبان میں "u" اور "i" صرف املا تک رہ گئے ہیں - اسی طرح مصمتوں کو بھی استقلال نہیں - جدید فرانسیسی میں کلموں کے آخری مصمتے استعمال نہیں ہوتے البتہ املا میں ان کا وجود ضرور ہے - "m" اور "n" پر ختم ہونے والے کلموں میں ماقبل مصوتہ انفی (غنہ) ہوجاتا ہے - فرانسیسی کلموں quatre اور Simple کے "r" اور "L" کی آوازیں غائب ہو جاتی ہیں — کبھی کبھی درمیانی مصمتوں کو بھی اڑا دیا جاتا ہے - قدیم انگریزی کے بعض کلموں سے "n" کی آواز ناپید ہوگئی مثلاً "uns" اور "under" سے "n" کی آواز حذف ہوئی تو "us" اور "other" رہ گئے - "half" اور "calm" میں "L" صرف املا تک محدود رہ گیا - "light" اور "bought" میں gh کی آواز ختم ہو گئی - ابتدائی مصمتے عموماً مستقل ہوتے ہیں لیکن انگریزی wrong gnau; know میں k‘ g اور w کی آوازیں اپنا بھرم نہ رکھ سکیں - blackguard اور cup board میں درمیانی مصمتوں "P" اور "K" کی آوازیں کون ادا کرتا ہے - ہم مخرج آوازوں کے مدغم ہونے یا ان میں سے ایک کے حذف ہونے کا کرشمہ دیکھئے کہ دوکلموں good اور deal کو علی الترتیب ادا کیا جائے تو "goodeal" ادا ہوگا اور سننے والا good deal ہی مراد لے گا - اور مثالیں ہیں wha(t)to do simp (le)ly-nex (t) tlme کا (ر) روانی -

صوتی ایجاز و اختصار کا عمل بتدریج ہوتا رہا ہے اور

سالہا سال کے بعد بہت سے کلموں نے وہ مختصر ہئیت اختیار کی جو رائج نظر آتی ہے ''ڈکا شالا'' ''یوک ترا''۔ ''چندری نکا'' '' پانچا و نشی ''۔ '' چٹ ککا '' ۔ '' و نڑشا '' '' سرس ستھان '' جیسے کلموں نے صوتی تغیرات اور اختصار کی کئی منزلیں بسوں میں جا کر طے کیں اور جدید ہند آریائی میں ٹکسال، جوتا، چاندنی - پچیس - چڑیا - بیٹا - سرہانا کی شکلیں اختیار کی ہیں - یوروپی زبانوں سے ان گنت کلموں کی مثالیں دی جاسکتی ہیں، جنھوں نے ایجاز و اختصار کا سفر طویل مدت میں طے کیا ہے - برصغیر کی جدید زبانوں کے بہت سے کلموں کی سرگذشت، ان کے حسب نسب اور ارتقائی سفر پر ہی غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے جن کا سراغ کول مثلاً، دراوڑی یا سنسکرت میں ملتا ہے، ایجاز و اختصار کے کرشموں نے انھیں کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ پراکرتوں اور اپ بھرنشوں میں اختصار کی بدولت انھوں نے کیا روپ دھارا اور پھر مزید اختصار نے جدید زبانوں میں ان کی کیسی کایا کلپ کردی - یہ سب عمل صدیوں کی تراش خراش، ایجاز و اختصار کا مظہر ہے -

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ زبانوں کا عام رجحان صوتی ہیئتوں کے اختصار کی طرف رہا ہے - سنسکرت، ژند، لاطینی، یونانی وغیرہ میں طول طویل بھاری بھر کم کلموں کی بھر مار تھی لیکن ان سے ماخوذ زبانوں میں کلمے مختصر ہوتے گئے - اس میں شک نہیں کہ کلموں کے صوتی اختصار کے ساتھ ساتھ صوتی طوالت کے رجحان کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں اور کلموں میں صوتی اضافے بھی ہوتے رہے ہیں - مثلاً مڈل انگلش

کا ایک کلمہ تھا " Soun " جس میں جدید انگریزی نے " d "
کا اضافہ کر کے " Sound " بنالیا ـ " whilst " اور
" amongst " بھی اسی ذیل میں آجاتے ہیں ـ وسطی ہند آریائی
کلمہ " اگ " (جا) صوتی اضافے سے " انگ " بن گیا ـ اور
اپ بھرنش سے ہوتا ہوا پنجابی میں آج بھی مستعمل ہے ـ لیکن اس
طرح کے صوتی اضافوں اور کلموں کو صوتی طول دینے کے
رجحان کی مثالیں زیادہ نہیں ملتیں ـ مجموعی طور پر صوتی
اضافوں کی بہ نسبت صوتی حذف و سقوط اور ایجاز و اختصار
کی مثالیں بہت زیادہ مل جاتی ہیں ـ ہر زبان کی صوتی تاریخ
میں تلفظ کی تسہیل کا رجحان نمایاں ہے اور زبان کا ارتقا عموماً
اسی سے عبارت ہوتا ہے، یہ اور بات ہے کہ بہت سے ماہرین
اسے صوتی تخریب قرار دیتے رہے ہیں ـ اس تسہیلی رجحان کو
کچھ بھی قرار دیا جائے اس کی حقیقت سے انکار ممکن نہیں ـ

آئیے ہم اس سوال پر غور کریں کہ آیا زبان کا تسہیلی
یا صوتی ایجاز و اختصار کا رجحان زبان کی توانائی سلب کرتا
اور اسے کم کار آمد بنا دیتا ہے یا اس کے برعکس اس کی
توانائی اور صلاحیتوں کو بہتر، زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ کار
آمد بناتا ہے ـ زبان ایک ادارہ ضرور ہے لیکن سماجی عمل کا
نتیجہ ہے ـ اسے سماج یا بولنے والوں سے الگ اکائی کی حیثیت
سے نہیں پرکھا جانا چاہئیے ـ اس کے کلموں کو، خودکار اور
بجائے خود قائم رہنے والے معروضی وجود کی حیثیت نہیں دی
جاسکتی ـ وہ تو بولنے والوں کی انفرادی اور سماجی ضرورتوں
کے تحت ان سے اضطراری یا ارادی طور پر وجود میں آتے
ہیں اور کوئی معروضی حیثیت نہیں رکھتے ـ ان کی قدر و قیمت

کا معیار ان کی اپنی صوتی حیثیت پر نہیں بلکہ ان کی ابلاغی حیثیت، بولنے والوں کے رویے اور ان کی نفسیات پر ہی استوار ہو سکتا ہے۔ مشہور ماہر لسانیات سویٹ (Sweet) نے اس بنیادی نکتے کو نظر انداز کر کے یہ رائے قائم کرلی تھی کہ آوازوں کا حذف و سقوط، تخریبی تغیر ہے اس کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ ہم عام بشریاتی معیار کو سامنے رکھیں تو معلوم ہوگا کہ کلمہ، بنیادی طور پر سمعی اثر پیدا کرنے کے لئے انسانی عضلات کا ترکیبی عمل ہے، جس سے انسان ناطق بنتا ہے۔ آوازوں کے اختصار سے نطقی محنت میں کچھ نہ کچھ کفایت ضرور ہوجاتی ہے انگریزی کلمے " had " کی مثال بے محل نہ ہوگی۔ اس کلمے کی اصل گاتھک کلمہ " habaidedeima " ہے۔ دونوں کے تلفظ پر غور کیجئے۔ اس میں شک نہیں کہ گاتھک بولنے والوں کے لئے اس کا تلفظ دشوار نہ تھا لیکن اس کی جانشیں صورتوں میں یہ کلمہ اپنے تلفظ کو کیوں برقرار نہ رکھ سکا! شاید اس لئے کہ اس کی صوتی ادائیگی میں اعضائے نطق پر زیادہ زور پڑتا تھا اور نسبتاً زیادہ عضلاتی محنت درکار تھی، تسہیلی رجحان نے اسے مستقل طور پر گوارا نہ کیا اور آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر اسے مختصر کردیا گیا۔ مختلف زبانوں کی صوتی تاریخ بھی یہی واضح کرتی ہے کہ پیچیدہ صوتی نظام غیر شعوری طور پر بتدریج آسان بنائے جاتے رہے ہیں۔ دقیق پیچیدہ اور طول طویل آوازیں نسبتاً آسان اور مختصر ہوتی رہی ہیں۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ تسہیلی رجحان یا صوتی

ایجاز و اختصار مجموعی طور پر "زبان" کی ترقی ہی ہے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ زبان کے لئے مفید ہوتا ہے اور اس سے زبان کی توانائی اور صلاحتیں بڑھتی ہیں۔ ہاں کبھی کبھی ایجاز و اختصار سے کلمہ مبہم بھی ہوسکتا ہے ۔ ٹیلی گراف کے اسلوب یا بعض ادبی اسالیب کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے لیکن زبان کے ارتقا کے دوران ایسی نوبت شاذ و نادر ہی آتی ہے کہ صوتی اختصار سے کلمہ مبہم ہوجائے ۔ ایسی صورت میں صوتی تبدیلی کو قبول عام کی سند نہیں ملتی اور مختصر لیکن مبہم ہیئت رائج نہیں ہو پاتی ۔

صوتی اختصار کا طبیعی اور عضلاتی پہلو ہی نہیں بلکہ نفسیاتی پہلو بھی غور طلب ہے شاید خیالات اور احساسات کے اظہار و ابلاغ میں وقت کی بھی تھوڑی بہت کفایت ہو جاتی ہے ۔ تقلیل محنت، وقت کی کفایت وغیرہ کے علاوہ ایک اور فائدہ بھی ہوتا ہے اور وہ ہے حافظے اور دماغی کام کی سہولت کا۔ مثلاً انگریزی کلمہ "had" ایجاز و اختصار کی اس منزل پر آکر گاتھک کے کم و بیش ان سولہ کلموں کا حصر کرلیتا ہے جو تین مختلف ضمائر، تین اعداد اور دو اطوار (moods) کے اظہار کے لئے الگ الگ استعمال ہوتے تھے ۔ اس طرح دماغی محنت کی خاصی کفایت ہوگئی اور حافظے کی سہولت بھی ۔ گاتھک میں شخصی لاحقے بھی مستعمل تھے اور ضمائیر شخصی بھی جس طرح فارسی میں "من کردم"۔ "تو رفتی"۔ "ایشاں گفتند" میں ۔ ظاہر ہے کہ ان میں شخصی لاحقوں "م" ۔ "ی"۔ "ند" کو یا "من"۔ "تو" "ایشاں"۔ کو غیر ضروری قرار دیا جا سکتا ہے ۔ لاطینی،

یونانی، ویدک، سنسکرت، گاتھک وغیرہ تصریفی اختتامیوں کی کثرت کی وجہ سے حافظے اور دماغی عمل کے لئے خاصی بوجھل محسوس ہوتی ہیں۔ ان اختتامیوں کا تصریفی عمل دماغ سوز ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اعتراض کیا جائے کہ ان زبانوں کے بولنے والوں کے لئے تصریفی اختتامیوں کی کثرت اور ان کی پیچیدگیاں بوجھل نہیں تھیں اور وہ باآسانی ان سے عہدہ برآ ہوتے تھے اگر یہ واقعی سچ ہے تو ان زبانوں کے اختتامیے آہستہ آہستہ آسان اور کم تر کیوں ہوتے گئے۔ ان کے بولنے میں کسی قسم کی کوئی طبیعی اور دماغی کاوش نہیں کرنی پڑتی تھی تو ان کو مختصر کیوں کیا جاتا اور ان میں سے کچھ کو ترک کیوں جاتا رہا۔ ان اختتامیوں میں اختصار اور کمی کا رجحان بولنے والوں کے لسانی عمل ہی کا تدریجی نتیجہ ہے۔ افعال کی تصریف میں پیچیدگیاں ہی نہیں بے ربطی بھی رہی ہے لیکن تسہیلی رجحان اور قیاس تمثیلی کی بدولت پیچیدگیوں اور بے ربطیوں میں کمی ہوتی گئی۔ ہیئتوں کی تشکیل میں بے ربطی کے علاوہ ان کے استعمال میں بھی بے ربطی کی مثالیں کچھ کم نہیں — اسی لئے ان زبانوں کی نحو بھی پیچیدہ رہی ہے۔ ان کی بعد کی صورتوں میں پیچیدگی کسی قدر کم ہوتی گئی اور ماخوذ زبانوں میں آہستہ آہستہ منطقی سادگی پیدا ہوتی گئی۔ قدیم اور جدید زبانوں کے تقابل سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔ لاطینی، یونانی اور قدیم انگریزی کے مقابلے پر جدید انگریزی میں منطقی سادگی ہے۔ ویدک زبان کی بہ نسبت سنسکرت کم پیچیدہ ہے۔ وسطی ہند آریائی زبانیں اس سے زیادہ صاف اور سادہ ہیں اور جدید ہند آریائی

میں ان سب کے مقابلے پر منطقی سادگی ہے۔ ظاہر ہے کہ زبان میں بڑھتی ہوئی تنظیم اور منطقی سادگی، بولنے یا سیکھنے والوں کے لئے مفید ہی ثابت ہوتی ہے۔

جب بولنے والوں کے تسہیلی رجحان کی وجہ سے مفرد کلمے مرکب اور پیچیدہ کلموں کی جگہ لے لیتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں جب زبان ترکیب و تالیف کی منزل سے تحلیل کی منزل پر پہنچ جاتی ہے۔ تو معنویاتی وسعت بھی پیدا ہوتی ہے۔ ترکیبی و تالیفی کلمے میں اس کے مختلف اجزا پر الگ الگ زور یا تاکید ممکن نہیں ہوتی۔ کسی جزو پر زور یا تاکید سے مسئلہ معنی میں ایک نیا لطیف پہلو پیدا ہو سکتا ہے لاطینی ''Cantaveram'' میں شخصی، زمانی اور عمل کے عناصر شامل ہیں لیکن اس کی ادائیگی کے وقت کسی ایک عنصر پر زور یا تاکید ممکن نہیں لیکن یہی بات انگریزی میں کہی جائے یعنی I had Sung کہا جائے تو زور ''I'' پر بھی ہو سکتا ہے اور ''had'' اور ''Sung'' پر بھی۔ اس طرح تین لطیف معنویاتی پہلو پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ ملتانی میں کہا جاتا ہے ''جتم جوڑا پاٹی لایم'' تو ترکیبی عنصر میں سے کسی پر تاکید ممکن نہیں۔ ملتانی ''مریساں اس'' اور اردو ''میں اس کو ماروں گا'' کا تقابل کرلیجئے اول الذکر میں فاعل، مفعول، فعل پر الگ الگ زور دے کر تین مختلف معنویاتی پہلو پیدا کرنا آسان نہیں لیکن موخرالذکر میں آسان ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ تحلیل زبان میں لچک پیدا کردیتی ہے

اور ترکیب و تالیف سختی اور کڑاپن۔ افعال کی ترکیبی و تالیفی حیثیتوں کی سختی اور لچک کی کمی کو دیکھ کر ایسی زبانیں پائی جاتی ہیں جن میں اسم عام یا اسم جنس کی تعمیم کی صلاحیت نہیں مثلاً شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ کی قدیم زبانیں جن میں عام اسمائے جنس کے لئے تعمیمی کلمہ نہیں ہوتا۔ "ماں" "باپ"۔ "سر"۔ "آنکھ" جیسے عام اسموں کے لئے بھی اسمائے جنس یا اسمائے تنکیر نہیں ہوتے۔ ان کا اظہار کسی نہ کسی نسبت سے کیا جاتا ہے۔ گویا مضاف اور مضاف الیہ کا مخلوط تصور پیش کیا جاتا ہے یا اسم اور فعل کا تصور لازماً کسی نہ کسی شخصی تصور سے مخلوط ہوتا ہے۔ دور کیوں جائیے ملتانی زبان ہی کو لے لیجئے۔ اس میں ایک مخصوص معیشت سے تعلق رکھنے والی مادی اشیاء کے ناموں کی بہتات ہے لیکن تجریدی کلموں کی اسی قدر کمی ہے۔ اونٹ کی بارہ مختلف حیثیتوں یا قسموں کے الگ الگ نام ہیں مثلاً ۱۔ ڈاچی (اونٹنی) ۲۔ توڈا (اونٹ کا بچہ) ۳۔ کٹھیلا (ایک سال کا اونٹ) ۴۔ مزات (دوسال کا اونٹ) ۵۔ ترہان (تین سال کا اونٹ) ۶۔ لیہاس (چار سال کا اونٹ) ۷۔ چھتر (چھ سال کا اونٹ) ۸۔ لیش (جوان اونٹ) ۹۔ کہامبھا (بوڑھا اونٹ) ۱۰۔ جھڑوٹ (بوڑھی اونٹنی) ۱۱۔ مارھا دوڑنے والا اونٹ) ۱۲۔ پراف (چار سال تک کی ڈاچی) ان سب کلموں میں کوئی ایسی قدر مشترک نہیں جو اسم جنس کی نشان دہی کرے۔ گائے بھینس وغیرہ کے لئے بھی عام اسم جنس کی جگہ عمر کی نسبت سے الگ الگ نام ہیں کھجور کی مختلف صورتوں اور حیثیتوں کے لئے کم و بیش پچاس نام بتائے جاتے ہیں۔ "آپاے" کے لئے گوبر کی تازگی کی نسبت سے الگ الگ متعدد اسم ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح

کے ناموں کی بہتات سے ایک مخصوص معیشت کی مادی چیزوں جانوروں وغیرہ کی بھر پور تصویر سامنے آجاتی ہے لیکن ان سے زبان کے ایک مخصوص معیشت تک بلکہ اس کی مادی ضرورتوں تک محدود ہو جانے کا ثبوت مہیا ہوتا ہے اور زبان کے کمال کے بجائے اس کا عجز ظاہر ہوتا ہے۔ خانہ بدوش یا زرعی معیشت (اور وہ بھی قدیم زرعی معیشت) سے تعلق رکھنے والی مادی چیزوں' اور جانوروں کے ناموں کی بہتات سے زبان ترقی نہیں کرتی۔ لسانی ترقی کے لئے زبان کی تجریدی صلاحیت اور تجریدی ناموں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس زبان میں ایک پوری جنس کے لئے تعمیمی نام رکھنے یا Generic name مقرر کرنے کی اور صفات کی تجرید اور ان کی مدد سے اسم جنس کی مخصوص قسموں اور نوعیتوں وغیرہ کی نشان دہی کی صلاحیت نہ ہو وہ ایک محدود اور ایک مخصوص تہذیبی سطح پر ٹھہرے ہوئے معاشرے کی زندہ بولی تو کہلا سکتی ہے لیکن اس معاشرے کی ذہنی' علمی اور ادبی ترقی کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ ایسی زبان میں تحلیل سے پیدا ہونے والی وہ لچک اور تجرید سے حاصل ہونے والی وہ صلاحیت نہیں ہوتی جو زبان کو ہر قسم کے افکار کے اظہار کے قابل بنا کر ترقی کی منزلوں سے روشناس کراتی ہے۔

ہند یوروپی خاندان کی قدیم زبانوں میں افعال کی تصریف میں جنس' تعداد وغیرہ سے مطابقت کے قاعدوں کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔ ان زبانوں کا یہ رجحان آہستہ آہستہ ختم ہوتا رہا ہے۔ بول چال کی ''ڈینش'' میں فاعل کی تعداد اور شخصی حیثیت سے فعل کی مطابقت نہیں ہوتی۔ اگرچہ

انگریزی میں تصریفی نظام بہت سادہ ہوچکا ہے لیکن ڈینش زبان کا تصریفی نظام اس سے زیادہ سادہ ہے۔ انگریزی میں زمانہ حال واحد غائب دوسرے صیغوں سے مختلف ہے - ڈینش اس قسم کے تکلف سے آزاد ہوچکی ہے - جدیدہند آریائی زبانوں میں بنگالی نے کسی قدر ان تکلفات سے پیچھا چھڑالیا ہے - اردو، پنجابی وغیرہ میں فاعل کی جنس تعداد وغیر سے فعل کی مطابقت لازمی سمجھی جاتی ہے - مثلاً احمد خط لکھتا ہے - لڑکی خط لکھتی ہے - لڑکیاں آتی ہیں لڑکے جائیں گے - وہ آئے گا - میں فعل، فاعل کی جنس، اور تعداد کے مطابق استعمال کیا گیا ہے اردو کے فعل ماضی متعدی میں بہ ظاہر یہ مطابقت نظر نہیں آتی - مثلاً "میں نے روٹی کھائی" "لڑکی نے خط لکھا" میں فعل کی مطابقت فاعل "میں" یا "لڑکی" سے نہیں - اس میں شک نہیں کہ روٹی کھانے اور خط لکھنے کا کام "میں" اور لڑکی نے کیا لیکن قواعد کی رو سے ان کا استعمال فعلی حالت میں نہیں بلکہ آلی حالت میں ہے اسی لئے آلی علامت "نے" استعمال ہوتی ہے۔ اردو کا ماضی مطلق اپنی ساخت اور اصلیت کے اعتبار سے اسم مفعول ہے - "پڑھا" - "لکھا"- "کھایا" "گیا" - "مارا" اسم مفعول یا Past Participle ہیں- پڑھا کے لغوی معنی پڑھا گیا یا پڑھا ہوا - لکھا کا مترادف 'written' اور کھایا کا مترادف eaten ہے گویا ماضی مطلق یا دوسرے لفظوں میں اسم مفعول، مجہول کا صیغہ ہے اس لئے فعل کے طور پر استعمال ہونے کی صورت میں اس کا فاعل، سنسکرت قاعدے کے مطابق آلی حالت میں ہوجاتا ہے اسی لئے فاعل کے ساتھ آلی علامت "نے" بڑھا دی جاتی ہے۔ مجہول تشکیل

کی وجہ سے ''میں نے کتاب پڑھی'' کا لغوی مطلب انگریزی میں کچھ اس طرح ادا ہوگا - I (by me) book read ''لڑکی نے خط لکھا'' کا انگریزی ترجمہ ہوگا By (Girl) Letter written مجہولی تشکیل سے ''میں'' اور ''لڑکی'' فاعلی حالت میں نہیں رہتے بلکہ مفعول فاعل ہو جاتا ہے جو اصطلاح میں نائب فاعل کہلاتا ہے - اسی لئے فعل' تذکیر و تانیث میں نائب فاعل (یا معنوی طور پر مفعول) کے مطابق ہوتا ہے - چناںچہ مندرجہ بالا جملوں میں فعل کی تذکیر و تانیث ''کتاب'' اور ''خط'' کی تذکیر و تانیت'' کے مطابق ہے - قدیم اردو میں ایسا نہیں تھا - دکن اور برابر میں اب بھی ایسا نہیں ہے - عام بازاری زبان میں بھی بہت سے لوگ معیاری اردو کے اس قاعدے کی پابندی نہیں کرتے -

اسماء اور صفات کی تصریف میں بھی بعض زبانیں جنس اور تعداد وغیرہ سے مطابقت کا خاص لحاظ رکھتی ہیں- ہند یوروپی خاندان کی قدیم زبانوں میں اسماء اور صفات کی متعدد ہئیتیں ہوتی تھیں - سنسکرت میں اسم کی کم و بیش بارہ قسمیں ہیں اور ہر قسم کی گردان دوسری سے الگ اور مختلف ہے - پراکرتوں کے آخری دور میں اسماء کی صرف چھ قسمیں رہ گئیں - آریائی خاندان کی جدید زبانوں میں ان کی ہئیتوں کی تعداد خاصی کم ہوگئی - جو ہئیتیں یادگار کے طور پر باقی رہ گئیں ان کے اختتامیے ایجاز و اختصار کی بدولت بدل گئے یا ایک ہئیت کے تفاعل کی قیاسی توسیع نے انہیں بدل دیا - قدیم انگریزی میں good کے لئے کم و بیش دس صورتیں رائج تھیں--
goda 'godra 'godes 'goduni 'gode 'godne 'god

godena godan (بحوالہ یسپرسن)۔ مختلف ہیئتوں کی
یہ بہتات اعرابی حالتوں (cases) کی کثرت کی وجہ سے ہے۔
عموماً اعرابی حالتیں سات آٹھ ہوتی تھیں' پھر گھٹ کر تین
چار ہوئیں اور آخر اکا دکا رہ گئیں۔ اعرابی حالت کے قدیم نظام
میں ایک ہی کلمے کی متعدد ہیئتیں ہی پریشان کن نہیں ہیں بلکہ
تصریف کے مختلف زمروں میں ایک ہی اعرابی حالت کی تشکیل
کی جو مختلف صورتیں ملتی ہیں' ان سے الجھنیں اور بڑھ جاتی
ہیں۔ ایک ہی کلمے کی تصریف میں بے ربطیوں کی مثالوں کی
بھی کمی نہیں۔ قدیم زبانوں میں اعرابی حالتوں کا نظام بوجھل'
کڈھب اور بے ڈھنگا رہا ہے۔ حالتوں کا اظہار اختتامیوں کی
تبدیلیوں یا اسم کی تالیفی صورت کے ذریعہ سے ہوتا رہا ہے۔
لیکن انسان نے اپنے ارتقائی سفر میں بھونڈی اور بے ہنگم تہذیب
میں نظم و ترتیب قرینہ اور سلیقہ پیدا کر کے تہذیبی اور
معاشری سہولتیں بہم پنچائیں تو آہستہ آہستہ زبان کے بوجھل
اور کڈھب نظام میں بھی سلجھاؤ اور سلیقہ پیدا کر لیا۔
سنسکرت میں اعرابی حالتیں آٹھ تھیں۔ فاعلی' مفعولی' مفعولی
ثانوی' آلی' مجروری' اضافی' ظرفی' اور ندائی۔ ان کے لئے
الگ الگ علامتیں تھیں جو لاحقوں کی صورت میں کلموں کے
ساتھ متصل ہوتی تھیں اور ان کا جزو سمجھی جاتی تھیں۔
واحد اور جمع کی حالتوں کے اظہار کے لئے خفیف سا فرق ہو
جاتا تھا۔ کبھی کلموں کے خفیف سے تغیر سے بھی حالت کا
اظہار کیا جاتا تھا۔ گویا سنسکرت میں اعرابی حالتوں کا اظہار
کلموں کی تالیفی ہیئتوں کے ذریعے سے ہوتا تھا لیکن جدید
ہند آریائی زبانوں میں تحلیلی طور پر ہوتا ہے اور آزاد کلموں

کے ذریعے - بعض جدید زبانوں میں تالیفی حالتوں کی یادگاریں بھی مل جاتی ہیں، مرہٹی اور سندھی میں زیادہ اور اردو میں کم - اردو میں سنسکرت کی تالیفی ظرفی حالت کی یادگاریں "کنارے" - "سہارے" - "تلے" "آگے" - "نیچے" - "پیچھے" وغیرہ کی صورتوں میں نظر آتی ہیں - جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے سنسکرت میں اسماء کی کم و بیش بارہ قسمیں اور ہیئتیں ہوتی تھیں لیکن جدید ہند آریائی میں صرف دو صورتیں ہیں فاعلی اور غیر فاعلی یا قائم اور محرف - ان میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں، واحد اور جمع - فاعلی حالت قدیم سنسکرتی فاعلی حالت کی قائم مقام ہے - غیر فاعلی حالت بقیہ حالتوں میں سے کسی ایک یا زیادہ حالتوں کی نمائندہ ہے - اسم کی غیر فاعلی حالت ایک بنیادی حالت ہے، بقیہ حالیتں اس سے اس طرح حاصل کرلی جاتی ہیں کہ مختلف معانی واحوال ظاہر کرنے والے حروف و صلات اس میں جوڑ دیئے جاتے ہیں - ان زبانوں میں سنسکرت کے برعکس اسماء قریب قریب ایک جیسے ہیں اور ان کی گردانیں سب ملتی جلتی ہیں (اردو زبان کا ارتقا - صہ ۲۰٦ از ڈاکٹر سبزواری) جدید ہند آریائی زبانوں میں ہیئتوں میں معتدبہ کمی بھی ہوگئی اور ان کی گردان اور استعمال میں باقاعدگی اور نظم و ضبط پیدا ہونے سے خاصی سہولت، اور حافظے اور دماغی محنت میں کفایت ہوگئی جو زبانوں کے بولنے والوں کے لئے کار آمد ہے -

قدیم ہند یوروپی زبانوں میں جنس کی تمیز کا نظام بھی خاصا پیچیدہ رہا ہے - حقیقی جنس کا تعین تو خیر نسبتاً سیدھا سادا رہا ہے لیکن غیر حقیقی جنس میں بڑی بوالعجبی

نظر آتی ہے۔ ان سے ماخوذ زبانوں میں جنس کی تین قسمیں نہ رہیں ۔ جدید ہند آریائی میں تین زبانوں میں البتہ رہ گئی ہیں، مرہٹی، گجراتی اور سنہالی میں۔ بنگالی اور اڑیا میں جنس کا جھگڑا ہی نہیں رہا ۔ بعض زبانوں میں ضمائر کی بھی تذکیر و ثانیت ہوتی ہے ایسی زبانوں میں کبھی ضمیر کو جنس کے تعین کے بغیر استعمال کرنا پڑے تو مشکل پیش آتی ہے— اگرچہ انگریزی میں ضمائر کی جنس کا تعین نہیں ہوتا تاہم واحد غائب ضمیر میں he اور She کی تمیز کی وجہ سے کبھی کبھار اظہار خیال میں دشواری پیش آجاتی۔ مثلاً اگر یہ انگریزی جملہ ادا کیا جائے کہ If any body behaves thus he will be punished تو صحیح مفہوم ادا نہ ہوگا کیوں کہ 'any body' سے مراد دونوں جنس ہیں اور ''he'' مذکر ہے، اس لئے اس کے ساتھ She بھی کہنا ضروری ہے اگر he اور She دونوں کے لئے جنس سے معرا کوئی ضمیر ہوتی تو یہ دشواری پیش نہ آتی ۔ ضمائر جنس سے معرا ہوں تو خاصی نطقی کفایت ہوجاتی ہے۔ مثلاً انگریزی ضمیر who' چار صیغوں یعنی واحد غائب مذکر، جمع غائب مذکر واحد غائب مونث، جمع غائب مونث کے لئے استعمال ہوتا ہے -?who did it کہہ کر چاروں صیغے مراد لئے جاسکتے ہیں لیکن یہی جملہ لاطینی میں ادا کیا جائے تو ضمائر کے اختلافات کے ساتھ ساتھ چار مختلف جملے بولنے پڑیں گے۔ اردو ضمائر استفہام میں بھی جنس کی تمیز نہیں کی جاتی، اس لئے وہ بھی نطقی کفایت کے ضامن ہیں لیکن اردو میں اسماء صفات، ضمائر، مشتقات، افعال اور حروف اضافت وغیرہ میں مذکر مونث کی تمیز کی

جاتی ہے، اردو بولنے والوں کے لئے اس سے کوئی الجھن نہیں ہوتی لیکن غیر حقیقی جنس سے معرا زبانوں کے مقابلے پر تھوڑا بہت ذہنی بوجھ ضرور بڑھ جاتا ہے۔ اردو کو ثانوی زبان کی حیثیت سے سیکھنے والوں کے لئے بھی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اسی لئے بنگالی، آڑیا، بلوچی وغیرہ بولنے والے اردو کی تذکیر و تانیث میں کچھ نہ کچھ گڑ بڑا جاتے ہیں۔ ہندوستان میں اردو علاقوں کے علاوہ دوسرے حصوں میں اور پاکستان کے اکثر اندرونی علاقوں میں عام بول چال کی اردو معیاری اردو کی گرامر سے آزاد ہے اور اس میں غیر حقیقی جنس کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ بقول سنیتی کمار چڑجی یہ زبان گرامر کی انتہائی سادگی کی وجہ سے اتنی آسان ہے کہ غیر اردوداں عام بازار کی بول چال کی مدد سے ہی آسانی سے سیکھ سکتا ہے۔

قدیم زبانوں کے مقابلے پر جدید زبانوں میں کلموں کی ترتیب میں زیادہ باقاعدگی اور تنظیم ملتی ہے اور ان کی گرامر زیادہ آسان اور نحو خاصی سہل ہوگئی ہے۔ ان کی تحلیلی اور تجریدی خصوصیت کی وجہ سے ہیئتوں کی زیادہ سے زیادہ اور آسان تشکیل ہو سکتی ہے۔ مثلاً اردو اور بعض ہند آریائی زبانوں میں اسماء اور صفات کے آگے " کرنا " یا " بنانا " بڑھا کر افعال آسانی سے بنائے جاسکتے ہیں مثلاً پسند کرنا۔ یقین کرنا۔ صاف کرنا تمیز کرنا۔ بےوقوف بنانا الو بنانا۔ نکو بنانا۔ وغیرہ

جدید زبانوں میں یہ تمام خصوصیات بتدریج پیدا ہوئی ہیں اور ان سب میں ان کی نوعیت اور وسعت مختلف ہے۔ لسانی ارتقا کی یہ خصوصیات یا ہند یوروپی زبانوں ہی میں نہیں بلکہ دوسرے

لسانی خاندانوں اور زمروں میں بھی نظر آتی ہیں۔ عبرانی، آشوری کے مقابلے پر زیادہ آسان اور منظم ہے۔ بول چال کی جدید عربی کلاسیکی عربی کی بہ نسبت زیادہ سہل ہے۔ کوپٹک زبان قدیم مصری زبان کے مقابلے پر آسان تر ہے۔ ترکی زبان کا ارتقا نسبتاً سست ہے تاہم جدید ترکی قدیم کی بہ نسبت آسان ہے۔ چینی زبان کی بھی یہی کیفیت رہی ہے۔ جنوبی افریقہ کی زبانوں نے بھی قدیم ابہام، اور بوجھل اور ان گنت ہیئتوں سے خاصی حد تک نجات حاصل کرلی ہے۔

مجموعی طور پر دنیا کی تمام جدید زبانیں اپنی قدیم صورتوں کے مقابلے پر اصوات، صرف اور نحو کے اعتبار سے سادگی کی طرف بڑھتی رہی ہیں اور اس سادگی سے ان زبانوں کے بولنے والوں کے لئے سہولتیں ہی پیدا ہوئی ہیں۔ اس لئے ہم لسانی ارتقا کو مفید اور کار آمد قرار دے سکتے ہیں۔ تقابلی لسانیات کے ماہرین نے قدیم زبانوں کے صوتی اور صرفی شکوہ کو معروضی حیثیت دے کر، صرف انہی کو ملحوظ رکھا اور بولنے والوں کی نفسیات، ان کی نطقی سہولت اور کفایت کو نظر انداز کردیا اس لئے وہ لسانی تغیرات کو لسانی انحطاط قرار دیتے رہے ہیں۔ لیکن آج کا ماہر لسانیات بشریاتی معیار کو ملحوظ رکھ کر یہ رائے ظاہر کرے گا کہ زبانوں نے پیچیدگی اور ابتری سے سادگی اور تنظم کی طرف ارتقائی سفر کیا ہے اور مجموعی طور پر ترقی کی منزلیں طے کی ہیں۔

کتابیات

" علم اللسان "	مولوی سید احمد دہلوی
" کیفیہ "	برجموہن دتاتریہ کیفی
" اردو زبان کا ارتقا "	ڈاکٹر شوکت سبزواری
" زبان کا آغاز "	ای-بی-ٹیلر
" اصول نفسیات "	ہربرٹ، اسپنسر
" لسان مطالعہ لسان "	وھٹنے
" زبان کی زندگی اور بالیدگی "	وھٹنے
" بول چال-تفاعل اور ارتقا "	جی-اے-دا لیگونا
" انسان کی قدامت "	اے کیتھ
" زبان کا آغاز ماہیت اور ارتقا "	آٹو یسپرسن
" زبان کی ترقی "	آٹو یسپرسن
" زبان کا آغاز اور ماقبل تاریخ دور "	جی-رے-ویز
" انسان کا توارث "	ڈارون
" لسانی نفسیات کے مسائل "	او-ڈٹرج
" نیم زبان "	ایل-باؤنن
" بول چال اور زبان کا نظریہ "	اے-ایچ گارڈنر
" بول چال کا فلسفہ " (انگریزی ترجمہ)	فریڈرک شلیگل
" مضامین "	ہربرٹ اسپنسر

صحت نامہ

درست	غلط	سطر	صفحہ
دامن	دمن	21	14
ان	این	3	14
نہیں	نھیں	21	14
نو بہ نو	نو بہ بنو	1	19
کے	کی کے	22	21
وثوق	بہ وثوق	14	22
واضح	واضع	16	23
طرز ہائے	طرفہائے	17	25
بھڑاس	بہڑس	2	29
مظہر	ومظہر	1	33
وظیفے	وظائے	1	33
نطق	تعلق	آخری	37
روابط	روالطہ	15	39
تخلیق	تحلق	22	39
جس وقت پہلے	جس پہلے	3	41
اصولوں	اصول	5	48
منفی	صفی	آخر	48
بول	ڈول	2	49
کلمات کو	کلمات کے	10	56
اجزائے ترکیبی	اجزا کے ترکیبی	20	56
زاہد	ناہید	21	81

درست	غلط	سطر	صفحہ
سیاسی	سیاسی	4	116
مفہوم	مفمو م	4	119
علامت جمع	علامت	8	124
مستعار	مسعار	15	124
کے	کی	13	126
رو	روح	9	128
جبلی	جلی	10	128
قواعد نوایں	قواعد نوبں	24	128
nueter	newler	22	131
جامد	جماد	5	143
ان	ن	6	143
نمایاں	لمایاں	9	143
مجموعوں	مجحموعوں	22	143
مجموعوں	مجموعے	23	143
تحلیل	تحلیل	7	144
دلالتیں	ولالتیں	15	153
گوتھانک	گوڈھانک	19	179
لیکن	لکین	13	191
ویدک	ویھک	3	197
اسنانی	السانی	15	203
لیکن	ایں	17	203
نارمل	ارمل	18	203

درست	غلط	سطر	صفحہ
تقلیل	ثقلیل	3	207
ہو تا	مو تا	آخری	220
لیکن	لکین	23	228
کاتھک	کاھک	13	246
نیش	ایش	17	250
پراسم	ماسم	17	253
لے	بے	12	254

ہماری دیگر مطبوعات
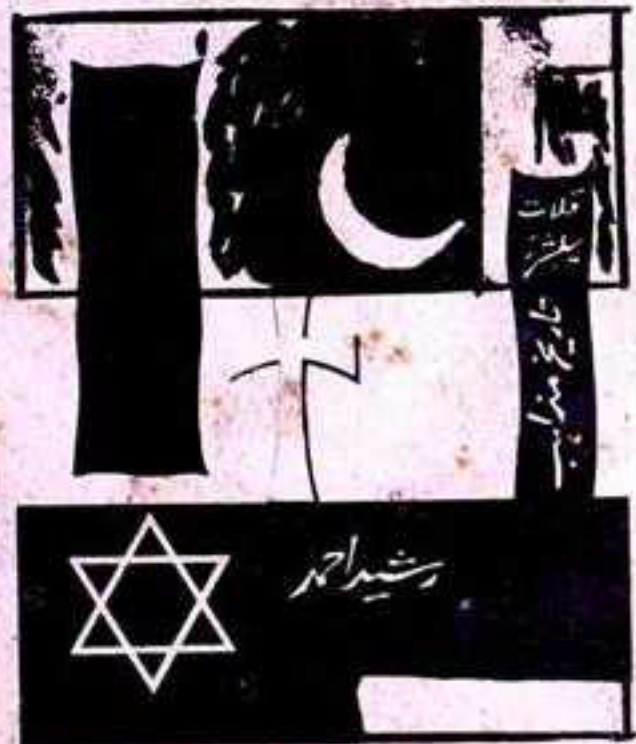
قلات پبلشرز
مستونگ
رستم جی لین، جناح روڈ، کوئٹہ